قومی زبان
بیادِ غالب

فہرست

خطبات مجلس یادگار غالب
پنجاب یونیورسٹی لاہور

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مطبوعہ انجمن پریس، نزد شو مارکیٹ، لارنس روڈ، کراچی۔ رجسٹرڈ ایس نمبر (۱۳۸)

تعارف

ڈاکٹر عبادت بریلوی

جناب صدر! معزز خواتین و حضرات!

آپ سب جانتے ہیں کہ غالب ایک عظیم شاعر ہیں، اور ان کی شاعری مجموعی طور پر ان تمام خصوصیات کا ایک نہایت ہی حسین و دل آویز مرقع ہے، جن کو شاعروں، شعر کے پرستاروں اور شاعری کے ادا فہموں نے شاعرانہ عظمت اور عظیم شاعری کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ ان کی عظیم شاعرانہ عظمت کا راز اس میں ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی کے نہ صرف جذباتی اور ذہنی بلکہ معاشرتی اور معاشی معاملات و مسائل تک کو اس طرح شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ اس میں ہر شخص اپنے معاملات و مسائل کی تصویریں دیکھتا ہے۔ اور ان کی شاعری میں وہ جو ایک عجیب سی آواز گونجتی ہوئی ہے، وہ اس کو اپنی آواز معلوم ہوتی ہے۔ یہ آفاقیت اور آفاقیت پسندی انھیں انسانی زندگی کے شدید احساس، اس کے معاملات و مسائل کے گہرے شعور اور انسانیت، انسان دوستی اور انسانیت پسندی کے واضح تصور کے نتیجے میں نصیب ہوئی ہے۔ یہ تصور انھیں ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ اور اسی کی شمع کو ہاتھ میں لے کر وہ ہمیشہ زندگی کے راستے پر گامزن رہے ہیں۔ اسی تصور نے انھیں وادیٔ خیال کو مستانہ طے کرنا سکھایا ہے۔ ان کے ہاں اس کائنات کی حیثیت، اس میں انسانی زندگی کی اہمیت اور اس زندگی میں انسان کی عظمت کے جو خیالات ملتے ہیں اس کے چشمے بھی انسانیت، انسان دوستی اور انسانیت پسندی کے اسی تصور ہی سے پھوٹتے ہیں۔ غالب نے جذبے اور فکر کے متوازن امتزاج سے اپنی شاعری میں ایک نئی دنیا پیدا کی ہے اور اس دنیا میں ان کے نئے جمالیاتی احساس و شعور نے کچھ ایک ایسا عالم پیدا کر دیا ہے، جو میدانوں میں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی چاندنی کی مسکراہٹوں میں نظر آتا ہے۔ اور یہی صورت حال انھیں شاعرانہ عظمت کی انتہائی بلندیوں سے ہمکنار کرنے کا باعث بنی ہے۔

غالب کی اس عظمت کا اعتراف گزشتہ سو سال سے مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ اس اعتراف کی سب سے اہم صورت غالب کے جشنِ صد سالہ کی وہ تقریبات ہیں، جن کا سلسلہ گزشتہ سال ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر شروع ہوا تھا۔ اور جو، اب تک کسی نہ کسی صورت میں، نہ صرف پاکستان اور ہندوستان میں، بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں جاری ہے۔

حکومت پاکستان اور یونیسکو کے ایما پر پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام لاہور میں ۲۸-۳۰ دسمبر کو بین الاقوامی مذاکرۂ غالب منعقد ہوا تھا۔ اس مذاکرے کا تعارف، اور استقبالیہ، افتتاحیہ اور صدارتی خطبات "قومی زبان" میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

یہ بین الاقوامی مذاکرۂ غالب بھی، جو اس سال پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام ترتیب دیا گیا ہے۔ غالب کے اسی جشن صد
کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ بین الاقوامی مذاکرہ، یونیسکو کے تعاون سے حکومت پاکستان کی فرمائش پر، پنجاب یونیورسٹی نے
ترتیب دیا ہے۔ اور اس مذاکرے کی انتظامیہ اس کے لیئے یونیسکو اور حکومت پاکستان دونوں کی شکر گزار ہے۔ نہ صرف اس
لیئے کہ یہ کام پنجاب یونیورسٹی کے سپرد کیا گیا ہے، بلکہ اس لیئے کہ پنجاب یونیورسٹی نے غالب کے جشن صدسالہ کے سلسلے میں علمی
کے جو منصوبے بنائے تھے، ان کو تو گذشتہ سال مکمل کرلیا۔ لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے یونیورسٹی اس طرح کے بین الاقوا
مذاکرے کا کوئی خاطر خواہ اہتمام نہ کرسکی۔ اب یونیسکو اور حکومت پاکستان کے تعاون سے اس کا اہتمام ممکن ہوا۔ اور جشن صدسا
کے منصوبے کی تکمیل میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ اب اس بین الاقوامی مذاکرے کے اہتمام سے بڑی حد تک پوری ہوگئی۔

گذشتہ سال دنیا کے کئی اہم ممالک میں غالب کا صدسالہ جشن بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ اور اس سلسلے میں، افراد نے
اس شاعر کو خراج تحسین پیش کیا۔ اور اداروں نے بھی۔ امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں میں جلسے کیئے گئے جن میں غالب کی شخصیت
شاعری پر لیکچروں کا انتظام کیا گیا اور انگریزی میں اس عظیم شاعر کی غزلیات کا ترجمہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ کچھ ترجمے چھ
کر سامنے بھی آئے۔ شکاگو یونیورسٹی نے خاص طور پر لیکچروں کا انتظام کیا۔ اور پاکستان سے پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانس
اور مشہور غالب شناس پروفیسر حمید احمد خاں اور ہندوستان سے پروفیسر محمد مجیب اور پروفیسر آل احمد سرور کے ایسے غ
شناس لیکچر دینے کے لیئے وہاں بلائے گئے۔ ہارورڈ میں درّانی فاؤنڈیشن نے بھی غالب کے کام میں مدد کی اور اسکول آف
اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن کے ساتھ تعاون کیا۔ جس کے نتیجے میں رالف رسل اور خورشید الاسلام کے کام کا ایک حصہ
" Ghalib - Life & Letters " مکمل ہو کر سامنے آیا۔ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں غالب کے
جشن صدسالہ کی تقریبات کو منانے کے لیئے ایک انجمن قائم کی گئی۔ اور بڑے پیمانے پر ایک جلسہ ترتیب دیا گیا، جس میں اسکول
کے ڈائرکٹر پروفیسر فلپس، اردو کے صدر رالف رسل، تاریخ کے استاد ڈاکٹر ہارڈی اور کیمبرج کے مشہور و معروف استاد تاریخ
پرسیول اسپیر وغیرہ نے مقالے پڑھے۔ اسی طرح چیکوسلاویکیہ میں بھی یان ماریک اور ہیشن منووانے غالب پر کام کیا۔ روس
میں رحمان بروی محمد جانوف اور ان کے ساتھیوں نے غالب کا ترجمہ کرکے اور مضامین لکھ کر اس عظیم شاعر کو اپنے ملک میں
روشناس کرانے کی کوشش کی۔ اٹلی میں بوسانی نے پروفیسر احمد علی کے تعاون سے غالب کو روشناس کیا۔ ہندوستان میں بھی
ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں دنیا کے اہم غالب شناسوں نے شرکت کی اور مقالے پڑھے۔ اس کے علاوہ غالب پر وہاں خاص
تعداد میں کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ جن میں ڈاکٹر یوسف حسین کی "آہنگ غالب" پرتھوی چندر کی "جاگیر غالب" الیس۔ اے۔
ترمذی کی "Persian Letters of Ghalib" اکبر علی خان عرشی زادہ کا دیوان غالب نسخہ عرشی زادہ، پروفیسر محمد
کی "غالب (اردو کلام کا انتخاب)" مالک رام کی "عیار غالب" اور "گل رعنا" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پاکستان میں بھی کم و بیش اسی طرح کا کام ہوا۔ مختلف شہروں میں جلسے ہوئے۔ ادبی رسالوں نے خاص نمبر نکا

غالب کی شخصیت اور شاعری پر غالب شناسوں کی کتابیں شائع ہوئیں۔ کراچی میں ادارہ یادگار غالب کا قیام عمل میں آیا جس نے غالب لائبریری قائم کی، غالب پنسل بنائی، غالب کیلنڈر چھاپا اور غالب پر کتابیں بھی شائع کیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان بھی غالب پر اہم کتابیں شائع کرنے میں پیش پیش رہی۔ اس کے علاوہ مختلف غالب شناسوں نے بھی انفرادی طور پر اس موقع کے لیے تحقیقی اور تنقیدی کتابیں تالیف کیں اور ان کو نہایت اہتمام سے شائع کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعروں نے نظمیں لکھیں، مصوروں نے تصویریں بنائیں۔ بت تراشوں نے بت تراشے، فلمسازوں نے فلمیں تیار کیں، ڈرامہ نگاروں نے ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے اور موسیقاروں نے غالب کو موسیقی کے سروں میں مجسم کرنے کی کوشش کی، اور اس طرح ہر شخص نے اپنی اپنی جگہ اس عظیم شاعر کو خراج عقیدت پیش کیا۔

یہ تمام کام اپنی اپنی جگہ اہم ہیں ان کی وجہ سے غالب کی شخصیت اور شاعری کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئے اور اس عظیم شاعر کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ نہ صرف خواص بلکہ عوام کو بھی ہوا۔ علمی اور ثقافتی ادارے کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی بھی اس کام میں کسی سے پیچھے نہیں رہی اور اس سلسلے میں اس نے جو کارنامہ انجام دیا اس کو غالب شناسی کی تاریخ میں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ بظاہر یہ بات خود ستائی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی یونیورسٹی نے کسی ایک شاعر کے جشن صد سالہ کے موقع پر اتنے تھوڑے عرصے میں، علمی اعتبار سے اتنی وقیع کتابیں نہیں شائع کی ہوں گی جتنی کہ گذشتہ سال پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیں۔ غالب کی تمام اردو اور فارسی تصانیف کو اعلیٰ درجے کی ترتیب و تدوین کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کر دینا آسان بات نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ان حالات میں کہ ان کی تصانیف اس سے قبل، پرانے انداز میں بغیر صحت کا لحاظ کیے ہوئے، ترتیب و تدوین کے بغیر چھاپ دی گئی تھیں لیکن وہ بھی نایاب تھیں۔

اس سلسلے میں سید وزیر الحسن عابدی کی مرتب کی ہوئی غالب کی۔ (1) غزلیات فارسی (2) پنج آہنگ (3) سبد چین (4) افادات غالب (یعنی لطائف غیبی، سوالات عبدالکریم اور تیغ تیز)، مولانا غلام رسول مہر کی (1) قصائد و مثنویات فارسی (2) قطعات و رباعیات، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس اور (3) خطوط غالب (اردو، دو جلدیں) ڈاکٹر محمد باقر کی (1) درفش کاویانی اور (2) قادر نامہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن کی مرتب کی ہوئی (1) مہر نیمروز اور (2) دستنبو، مولانا حامد علی خاں کا دیوان غالب اور سید معین الرحمان کی کتاب "اشاریہ غالب" خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں تحقیق کے جو اعلیٰ معیار قائم کیے گئے ہیں۔ اور حواشی لکھنے میں جس قدر محنت اور جانفشانی سے کام لیا گیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اس تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کی مجلس یادگار غالب نے انگریزی زبان میں گروپ کیپٹن سید فیاض محمود کی "Ghalib-A Critical Introduction" اور اردو میں "تنقید غالب کے سو سال" مرتبہ سید فیاض محمود اقبال حسین بھی شائع کیں اور اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کتابوں نے مغرب و مشرق میں غالب کو

تنقیدی اعتبار سے روشناس کرانے میں ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ یونیورسٹی کے جرنل آف ریسرچ نے بھی ایک ضخیم غالب نمبر شائع کیا۔ جس میں غالب پر اعلیٰ درجے کے تحقیقی اور تنقیدی مقالے شائع ہوئے۔ اس کو شائع کرنے کا سہرا پروفیسر سراج الدین اور اقبال حسین صاحب کے سر ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ جو اساتذہ منسلک ہیں انھوں نے انفرادی طور پر بھی اس جشن صدسالہ کے موقع پر غالب شناسی کے سلسلے میں اپنے تحقیقی اور تنقیدی کام کو شائع کیا۔ اور اس طرح غالبیات میں قابل ذکر اضافے کیے۔ سید وزیر الحسن عابدی نے غالب کی غیر مطبوعہ تالیف "گل رعنا" کے کئی نسخے تلاش کیے اور اس کو مرتب کر کے ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان لاہور سے شائع کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے غالب کے کلیات فارسی کا بھی ایک ایڈیشن تیار کیا جسے مکتبہ میری لائبریری، لاہور نے شائع کیا۔ ڈاکٹر عبداللہ کی کتاب "اطراف غالب" گذشتہ سال گلوب پبلشرز لاہور سے شائع ہوئی۔ اور اس سال ڈاکٹر وحید قریشی کے مقالات کو سنگ میل پبلشرز، لاہور نے "نذر غالب" کے نام سے شائع کیا۔ اس خاکسار (ڈاکٹر عبادت بریلوی) کی دو کتابیں (۱) غالب اور مطالعۂ غالب (۲) غالب کا فن، علی الترتیب رائٹرز اکیڈمی لاہور اور گلوب پبلشرز لاہور نے شائع کیں۔ ان کے علاوہ یونیورسٹی کے اساتذہ نے اس موقع پر خاصی تعداد میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات بھی لکھے جو معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

جشن غالب کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی میں جو کام ہوا۔ اس کی تفصیل میں نے یہاں حرف خودستائی کے خیال سے پیش نہیں کی ہے۔ اس کا مقصد تو اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس یونیورسٹی نے غالب کے صد سالہ جشن کے موقع پر جو کام کیا اس سے ایک عظیم روایت قائم ہوئی اور اس طرح اطراف عالم میں اس کا نام روشن ہوا۔

اس بین الاقوامی مجلس مذاکرہ کی ترتیب میں یہ عظیم روایت ہمارے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی اور اس کو سامنے رکھ کر ہم نے اس کام کا آغاز کیا۔ اس روایت کے احساس نے ایک طرف تو ہمارے دلوں میں حوصلوں اور ولولوں کے چراغ روشن کیے اور دوسری طرف اس بین الاقوامی مذاکرے کو یونیورسٹی کے شایان شان بنانے میں ہمیں محنت سے کام کرنے کی ترغیب دی۔ بہرحال ان احساسات کے ساتھ ہمارے سفر کا آغاز ہوا اور اس طویل سفر کو طے کرنے کے بعد ہم آج جس منزل پر پہنچے ہیں وہ اب آپ سب کے سامنے ہے۔

• اگرچہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اور ہمیں اس بین الاقوامی مجلس مذاکرۂ غالب کو ترتیب دینے کے لئے ڈیڑھ دو مہینے سے زیادہ نہیں ملے۔ لیکن پھر بھی ہم نے اپنی سی پوری کوشش کی۔ کہ اس بین الاقوامی مذاکرے میں مغرب اور مشرق دونوں کی بھرپور نمائندگی ہو جائے۔ اس کے لئے ہم نے ذاتی سطح پر امریکہ کی ڈیوک یونیورسٹی کے پروفیسر آنسلی ایمبری، پنسلوینیا یونیورسٹی کے پروفیسر نارمن براؤن، ہارورڈ اور بون یونیورسٹی کی پروفیسر ڈاکٹر اینی میری شمل، روم کے پروفیسر الیسنڈرو بوسانی، روس کے پروفیسر رحمان بردی محمد جانوف اور چیکوسلواکیہ کے پروفیسر یان ماریک اور ہبش منووا اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے رالف رسل سے رابطہ قائم کیا۔ افسوس ہے کہ یہ غالب شناس اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس مذاکرے میں شریک نہ ہو سکے۔

ان میں سے بعضوں کے لیئے تو یہ مجبوری تھی کہ وقت بہت کم تھا اور اتنے کم وقت میں وہ اپنے ملکوں سے باہر نکلنے کا پروگرام نہیں بنا سکتے تھے۔ پروفیسر شمل کی طبیعت ناساز تھی اور پروفیسر بوسانی لکچر دینے کے لیئے دنیا کے مختلف ممالک میں جانے کا پروگرام بہت پہلے ہی بنا چکے تھے۔ رالف رسل نے یقیناً شریک ہونے کا پختہ وعدہ کیا تھا اور مجھے اور وائس چانسلر صاحب کو خاص طور پر اس سلسلے میں خط لکھے تھے، چنانچہ مذاکرے کی انتظامیہ کی طرف سے یہ خبر بھی شائع کردی گئی تھی کہ وہ شریک ہو رہے ہیں لیکن صرف چند روز ہوئے انھوں نے بعض مجبوریوں کی بنا پر معذرت کی اور مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ یہاں موجود نہیں ہیں اس کا بھی افسوس ہے کہ ہم اپنے ہندوستان کے غالب شناسوں کو بوجوہ اس مذاکرے میں شرکت کی دعوت نہ دے سکے۔

اب جیسا کہ پروگرام سے آپ کو معلوم ہوگا، انگلستان سے سیلون کالج آکسفورڈ یونیورسٹی کے فیلو ڈاکٹر سائمن ڈگبی، اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کے استاد اُردو ڈیوڈ میتھیوز، ترکیہ سے استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالقادر قرہ خان، ایران سے تہران یونیورسٹی کے ڈاکٹر ایرج افشار، افغانستان سے کابل یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حسین مجددی، اس مذاکرے میں شرکت فرما رہے ہیں۔ پاکستان میں مقیم ایرانی مندوب، خانہ فرہنگ ایران کی ڈائرکٹر خانم مریم بہنام اور فارسی کے وزیٹنگ پروفیسر ڈاکٹر احمد علی پناہی، ایرانی مندوبین کی حیثیت سے اس مذاکرے میں شریک ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم انھیں پاکستانی ہی تصور کرتے ہیں۔ پاکستانی مندوبین کی حیثیت سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، راجشاہی یونیورسٹی کے ڈاکٹر کلیم سہسرامی، کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر محمد طاہر فاروقی، ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر اے۔ بی۔ نسیم، کراچی سے مشہور محقق اور نقاد پروفیسر احمد علی، پروفیسر ممتاز حسین اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اور کوئٹہ سے ڈاکٹر انعام الحق کوثر بھی شرکت کے لیئے تشریف لا رہے ہیں۔ لاہور سے جیسا کہ آپ کو علم ہے، ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمان، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، پروفیسر سید وقار عظیم، سید وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر آفتاب احمد خاں، سید معین الرحمان، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسین، ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ اور ڈاکٹر بشیر حسین اس مذاکرے میں شریک ہیں۔

مغربی پاکستان کے سابق گورنر اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر جناب اختر حسین صاحب اس بین الاقوامی مذاکرے کا افتتاح فرما رہے ہیں۔ مختلف اجلاسوں کی صدارت ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمان، ہزایکسیلنسی محمد حسین مشائخ فریدنی اسفیر شہنشاہ آریا مہر ایران، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ڈائرکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ اور ڈاکٹر سید عبداللہ ناظم دائرۃ المعارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، فرما رہے ہیں۔

میں اس مذاکرے کی مجلس انتظامیہ کی طرف سے ان سب بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

کامیابی کے لیے ضروری ہے
کہ
آپ جو الفاظ استعمال کریں ان کے معنی سے آپ پوری طرح واقف ہوں
اِس سلسلے میں
دی اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری
آپ کی بہترین معاون ہوسکتی ہے۔
آپ گھر میں ہوں۔
دفتر میں ہوں۔
یا سفر میں۔
ہر جگہ یہ ڈکشنری آپ کی رفیق ہوگی۔
طلبہ، اساتذہ، وکلا، اطبا، مترجمین اور سرکاری کارکنوں کے لئے
دی اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری
بہترین تحفہ ہے
خوبصورت طباعت ٭ اعلا درجے کا بائبل پیپر ٭ ڈیڑھ ہزار صفحات ٭ مضبوط جلد ٭
قیمت: صرف ۶۰ روپے
انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

خطبۂ استقبالیہ

علامہ علاء الدین صدیقی وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

صدر محترم، معزز خواتین و حضرات!

یہ بین الاقوامی مجلس مذاکرہ جس عظیم شاعر کے نام سے منسوب ہے، اس کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ تبصرے کا حق ایشر کائے مذاکرہ کی وہ برگزیدہ جماعت ہی ادا کر سکتی ہے جو غالب شناس مبصرین و محققین پر مشتمل ہے۔ تاہم غالب کے ایک عقیدت مند قاری کی حیثیت سے جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے غالب کی انفرادیت اور شاعرانہ عظمت کے تین پہلو سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ غالب کا کلام، ایشیائی ثقافت اور بالخصوص اس مغلیہ ثقافت کا بہترین مظہر ہے۔ جس کی تشکیل اسلامی اقدار اور ہند ایرانی تہذیبی عناصر کے امتزاج سے ہوئی۔ غالب کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس ثقافت کے حسین نقش و نگار، اس کا جلال و جمال، پوری آب و تاب سے جلوہ فگن ہے۔ دوم یہ کہ غالب کے کلام میں وہ تمام فنی نزاکتیں اور لطافتیں جمع ہو گئی ہیں۔ جو فارسی غزل و تغزل کا طرۂ امتیاز ہیں۔ سعدی اور حافظ سے لے کر نظیری اور بیدل تک پہنچتے پہنچتے، فارسی غزل کا فنی ارتقا مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن غالب کے بہار آفریں تخیل نے اس زمین میں نئے گل بوٹے کھلائے اور اردو غزل کا دامن بھی معنی خیز ترکیب، بلیغ استعارات اور خیال افروز اشارات و علامات کے جواہر ریزوں سے مالا مال کر کے "ریختہ" کو "رشک فارسی" بنا دیا۔ یوں تو گزشتہ صدی میں غالب کے خطوط نے بھی اردو نثر نگاری میں ایک انقلاب برپا کیا۔ لیکن جہاں شعری اسالیب کا تعلق ہے، جس طرح گزشتہ ایک صدی میں ہمارے شعراء غالب سے اکتساب فن کرتے رہے۔ اسی طرح مستقبل میں بھی دیوان غالب کا چشمۂ فیض صدیوں جاری رہے گا۔

لیکن غالب کی عالمگیر شہرت و مقبولیت کا انحصار اس کے کلام کے اس آفاقی پہلو پر ہے جس کا تعلق انسانی فطرت کی گوناں گوں کیفیات اور انسانی زندگی کے بارے میں صحت مند تصوّرات سے ہے۔ غالب ہمیں زندگی سے پیار کرنا اور زخم کھا کھا کر مسکرانا سکھاتا ہے وہ ہمارے دکھ سکھ کا ساتھی اور ہماری امنگوں اور آرزوؤں کا ترجمان ہے۔ وہ ایک خزاں رسیدہ چمن کا عندلیب تھا۔ لیکن اپنے نغموں سے ایک "گلشن ناآفریدہ" کے خواب دکھاتا اور نادیدہ دنیاؤں کی تلاش پر اکساتا ہے ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں۔

انسانیت کا کارواں خواہ کتنا ہی آگے بڑھ جائے لیکن غالب کی یہ آواز ہمیشہ اسے نئی نئی منزلوں کی طرف سرگرم سفر رکھے گ

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

جب کوئی شاعر اس بلندی پر پہنچ جائے تو اس کی شہرت و مقبولیت کے آگے زمان و مکان اور زبان و قومیت کے دائرے ٹوٹ جا
ہیں۔ اور اس کی شاعری ابدیت و آفاقیت سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔

خواتین و حضرات! شہر لاہور کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ہند اسلامی ثقافت کا وہ درخشاں آفتاب جس نے اس برعظیم کے گوشے
گوشے کو منور کیا۔ اور جس کے جلوؤں کی رنگارنگی غالب کے کلام میں قوس قزح بن کر نمودار ہوئی۔ آج سے تقریباً ایک ہزار برس
پہلے اسی شہر میں طلوع ہوا تھا۔ درمیانی صدی میں بھی یہ شہر، اس تہذیب و ثقافت کا مرکز اور اس سے وابستہ علوم و فنون کا
گہوارہ بنا رہا۔ تاریخی و تہذیبی رشتوں کی بدولت فارسی و اردو زبان و ادب کو ہماری قومی زندگی میں علاقائی زبان و ادب پر ہمیش
فوقیت حاصل رہی۔ چنانچہ غالب کا کلام نظم و نثر عصر غالب ہی میں زندہ دلان لاہور کے لیئے سرمایۂ کیف و نشاط بن گیا۔ غالب کی و
کے بعد اس سرزمین میں اس کی ہر دلعزیزی روز بروز بڑھتی رہی، حتیٰ کہ موجودہ صدی کے اوائل میں غالب شناسی کے ایک نئے د
کا آغاز بھی لاہور ہی میں ہوا۔ جب ہمارے ایک قومی شاعر نے جو غالب ہی کے شعری دبستان کا نمائندہ تھا، غالب کے حضور میں ا
منظوم خراج عقیدت یوں پیش کیا۔ سہ

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

بیسویں صدی میں یہاں کلام غالب کی تفہیم و تنقید کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ اور لاہور کی ادبی مجالس میں غا
کے فکر و فن کی شمعیں نئی آب و تاب سے فروزاں ہوئیں۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی "مرقع چغتائی" ہے۔ جس میں لاہور کے ایک
مایہ ناز فن کار عبدالرحمٰن چغتائی نے اس ثقافت کی روح کو جو غالب کے شعروں میں رچی بسی ہے۔ اپنے موقلم سے حسین و رنگین
نقوش کی صورت میں متشکل کیا۔ مرقع چغتائی نہ صرف فن مصوری کا شاہکار ہے بلکہ اہل لاہور کی غالب پسندی کی علامت بھی

پنجاب یونیورسٹی نے نوجوانوں کے ذوق ادب کی تربیت کے لیئے کلام غالب کو ہر سطح پر شامل نصاب رکھا۔ اور غالب
ہمارے اساتذہ و طلبہ کے تحقیقی مطالعے کا اہم موضوع بنا رہا۔ شہر لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کی اس ادبی روایت کا تقاضا تھا کہ غا
صدی کی تقریب اس عظیم شاعر کے شایان شان منائی جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر اکتوبر ۱۹۶۸ء میں یونیورسٹی میں مجلس
یادگار غالب کی تشکیل ہوئی جس نے نمائشی دھوم دھام سے قطع نظر کر کے مستقل افادیت کے ٹھوس عملی کاموں پر اپنی توجہ مرکو

پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور لاہور کے ممتاز اہل قلم کے تعاون سے، تصانیف غالب کے متون کی تصحیح و تہذیب اور اٹھارہ مجلدات طباعت کا اہتمام، اس مجلس کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔

گذشتہ سال، غالب صدی کے موقع پر مشرق و مغرب کے مختلف مرکزی شہروں میں جشن صدسالہ کی تقریبیں منعقد ہوئیں۔ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے تعاون سے غالب سیمینار کا انعقاد، اس سلسلے کی تقریبات کا نتیجہ ہے۔ علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کے دائروں میں یونیسکو اقوام عالم کی نمائندگی کرتا ہے۔ پس یونیسکو کی جانب سے بین الاقوامی مذاکرے کی تجویز، غالب کی عظمت کے عالمی اعتراف کا اظہار ہے۔ یونیسکو کی اس تجویز کو قلیل ترین مدت میں بروئے کار لانے کے لیے حکومت پاکستان کی نظر انتخاب پنجاب یونیورسٹی پر پڑی اور ہم نے اس ذمہ داری کو ایک قومی اعزاز سمجھتے ہوئے، بصد خوشی قبول کیا۔

اگرچہ اس مہتم بالشان مذاکرے کے اہتمام کے لیے ہمیں بہت کم مہلت میسر آئی۔ اور اس مختصر عرصے میں بیشتر بیرونی مدعوئین کی تشریف آوری کے لیے مناسب انتظامات کی تکمیل ممکن نہ ہو سکی، تاہم مشرق و مغرب سے جو فضلا ہماری دعوت پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان کی شمولیت اس مذاکرے کی کامیابی کی ضامن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری کوشش کے ساتھ غالب کے نام کی کشش بھی کارفرما رہی جو دور دراز مقامات سے ان اساتذہ کرام کو یہاں کھینچ لائی۔ ہرچند کہ بیرونی ممالک کے شرکائے مذاکرہ، دنیائے ادب میں اپنے علم و فضل کے اعتبار سے محتاج تعارف نہیں، لیکن محض اظہار تشکر کے طور پر ان حضرات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

بیرونی نمائندوں میں، بلحاظ بعد مسافت، سرفہرست آکسفورڈ یونیورسٹی کے فاضل استاد سائمن ڈگبی اور لندن یونیورسٹی کے ڈیوڈ میتھیوز ہیں۔

اقوام مشرق میں ترکیہ، ایران اور افغانستان سے ہمارے مذہبی، سیاسی، ادبی، لسانی اور ثقافتی روابط اتنے قدیم اور معروف ہیں کہ ان کا بیان تحصیل حاصل ہے ان دیرینہ روابط کی بنا پر غالب کا ادبی سرمایہ ہماری مشترک میراث ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس ثقافتی ورثے کی قدر و منزلت کے احساس میں بھی وہ ہمارے ساتھ شریک ہیں۔ اور اسی احساس کے اظہار کے لیے ان تینوں ممالک کے نمائندے یعنی ڈاکٹر عبدالقادر قرخان (نمائندہ ترکیہ)، ڈاکٹر ایرج افشار (نمائندہ ایران)، محترمہ خانم مریم بہنام (ڈائرکٹر خانہ فرہنگ ایران، لاہور)، ڈاکٹر پناہی (نمائندہ ایران) اور جناب مجددی (نمائندہ افغانستان) اس اجتماع میں ہمارے درمیان موجود ہیں۔

مذاکرے کے سہ روزہ اجلاسوں میں مقامی اساتذہ کے علاوہ پاکستان کے مختلف تعلیمی و ثقافتی اداروں کے نمائندگان بھی غالب کے فکر و فن پر اپنے گراں بہا خیالات سے ہمیں مستفید فرمائیں گے۔ مجلس استقبالیہ کی جانب سے میں بیرونی و پاکستانی مہمانوں کے علاوہ ان تمام "یاران نکتہ دان" کا تہ دل سے شکر گزار ہوں، جنہوں نے مذاکرۂ غالب کے "صلائے عام" پر لبیک کہتے ہوئے، فاضلانہ و محققانہ مقالات کی ترتیب میں اپنے قیمتی اوقات صرف کیے اور اپنی شرکت سے اس مذاکرے کی ظاہری

رونق اور معنوی اہمیت میں اضافہ کیا۔

مذاکرے کے افتتاح کی رسم ڈاکٹر اختر حسین صاحب، سابق گورنر مغربی پاکستان ادا فرما رہے ہیں۔ اور افتتاحی اجلاس ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان صاحب، سابق چیف جسٹس، سپریم کورٹ پاکستان، کی صدارت میں منعقد ہو رہا ہے۔ یہ دونوں بزرگ ملک کی انتظامیہ و عدلیہ کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز رہ چکے ہیں۔ لیکن ہماری نگاہ میں وہ قومی زبان و ادب کے محسن و سرپرست کی حیثیت سے زیادہ محبوب و محترم ہیں۔ مذاکرے کا چوتھا اجلاس غالب کی فارسی نظم و نثر کے لیے مخصوص ہے اور اس اجلاس کی صدارت کے لیئے جناب ڈاکٹر محمد حسین مشائخ فریدنی کو زحمت دی گئی ہے جو حکومت ایران کی معارف پروری اور ثقافت نوازی کے بہترین نمائندے ہیں۔ دوسرا، تیسرا اور آخری اجلاس، علی الترتیب ڈاکٹر شیخ محمد اکرام صاحب، ڈائرکٹر، ادارہ ثقافت اسلامیہ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی، وائس چانسلر، اسلام آباد یونیورسٹی، اور ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب، ناظم، دائرۃ المعارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی کے زیر صدارت منعقد ہوگا۔ مجلس استقبالیہ ان تمام کرم فرماؤں کی بے حد ممنون ہے کہ انہوں نے ہماری درخواست پر مجلس مذاکرہ کی صدارت کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

خواتین و حضرات! آج دنیا مختلف متصادم و متحارب گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ متضاد نظریات و مفادات کی کشمکش میں انسانیت کی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ اعلیٰ ادب، رنگ و نسل اور زبان و تمدن کا فرق مٹا کر انسانی فطرت اور زندگی کے مشترک عناصر کو اجاگر کرتا اور ہمیں اتحاد و اخوت کا پیغام دیتا ہے۔ غالب کی شاعری بھی ظاہری اختلافات کے ہنگاموں میں انسانی وحدت کے رشتوں کا احساس دلاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ غالب کی یاد میں گزرنے والے لمحات ہماری تہذیب نفس کا باعث ہوں گے۔ اور اس قسم کے بین الاقوامی ادبی اجتماعات سے مشرق و مغرب کے درمیان رابطۂ اتحاد استوار ہوگا۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اس مذاکرے میں آپ سب خواتین و حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

خطبۂ افتتاحیہ

اختر حسین صدر انجمن کراچی

جناب صدر اور محترم خواتین و حضرات!

اہلِ علم کی اس مجلس میں شرکت میرے لیئے ایک ایسا اعزاز ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ میں اس مجلس مذاکرہ کے منتظمین خصوصاً علامہ علاء الدین صدیقی وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس یادگار تقریب میں مدعو کرکے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔

یہ امر موجب مسرت ہے کہ یہ مجلس مذاکرہ جو غالبؔ کی صد سالہ برسی کی تقریبات کی ایک کڑی ہے۔ حکومت پاکستان اور یونیسکو کے ایما پر منعقد ہو رہی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے اپنی دیرینہ علمی روایات کے مطابق اس کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے لئے حکومت پاکستان اور یہ دونوں ادارے تمام غالب دوستوں کی مبارک باد اور شکریئے کے مستحق ہیں۔

حضرات! یہ شہر جس میں آپ غالب کے فکر و فن کی ابہام و تفہیم کے لیے جمع ہوئے ہیں، تہذیبی اعتبار سے انھیں قدروں کا حامل ہے، جن کا جمالیاتی پہلو، بقول رشید احمد صدیقی، کہیں تاج محل میں نظر آتا ہے، کہیں اردو زبان میں اور کہیں خود مرزا اسد اللہ خان غالبؔ میں۔ لاہور کو ایک عظیم تہذیبی مرکز کی حیثیت سے برصغیر ہند و پاکستان ہی میں نہیں، پوری مشرقی دنیا میں جو اہمیت حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ تاریخ کے ہر موڑ پر یہ شہر سرافراز و سربلند رہا ہے۔ کبھی یہاں سے تاریخ ساز تحریکوں کے چشمے پھوٹے ہیں اور کبھی علم و یقین کی امواج نور نے دور دور تک دلوں اور ذہنوں کو روشن کر دیا ہے۔ یہاں کے آسودگانِ خاک میں کج کلاہ بھی ہیں، صاحبانِ فکر و نظر بھی ہیں اور محرمانِ نواہائے راز بھی۔ ان سب نے اپنے اپنے دائروں میں رہ کر اس شہر کی تہذیبی روایات کو قائم کیا، فروغ دیا اور زندہ رکھا، اور یہ انھیں آسودگانِ خاک کا فیضان ہے کہ یہ شہر محض ایک شہر نہیں رہا بلکہ مشرق کی ایک عظیم تہذیبی علامت بن گیا۔ ایک ایسی علامت جو تاریخ کے صفحات پر ہی نظر نہیں آتی، بلکہ آج بھی اس شہر کے در و دیوار سے نمایاں ہے۔

علم و فن ہوں یا کار و بارِ سیاست، اس شہر نے ہر نئی تحریک کا ساتھ دیا ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیشتر نئی

تحریکیں اسی کی خاک سے ابھری ہیں۔ خصوصاً گزشتہ پون صدی میں جتنی بھی سیاسی، ادبی اور علمی تحریکیں اٹھی ہیں، وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی شہر سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی راوی کے کنارے کانگریس نے مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا اور یہیں مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ اسی شہر میں مولانا محمد حسین آزاد نے جدید شاعری کی بنیاد رکھی، اور اسی بنیاد پر علامہ اقبال نے وہ عظیم الشان عمارت تعمیر کی جو اپنے شکوہ و جلال کے اعتبار سے بے مثال ہے۔

لاہور کے اس تہذیبی پس منظر میں جب میں آج کی مجلس مذاکرہ پر نظر ڈالتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نامورانِ اہلِ علم دہلی کے مرزا اسد اللہ خان غالب کے فکر و فن کا جائزہ لینے کے لیے نہیں بلکہ اسی شہر کی ایک تہذیبی روایت کے جلال و جمال کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔

حضرات! غالب کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں آپ نہ صرف یہ کہ بہت کچھ جانتے ہیں، بلکہ آپ ہی کے توسط سے اس سلسلے میں دوسروں کو بہت کچھ جاننے کا موقع ملا ہے، لہٰذا آپ ہی کے توسط سے اس سلسلے میں دوسروں کو بہت کچھ جانتے ہیں، بلکہ آپ ہی کے توسط سے اس سلسلے میں دوسروں کو بہت کچھ جاننے کا موقع ملا ہے، لہٰذا آپ کی موجودگی میں میرا یہ منصب نہیں ہے کہ میں ان باتوں کا اعادہ کروں، جو آپ پہلے ہی سے اور بہتر طور پر جانتے ہیں۔ غالب کے ایک مداح کی حیثیت سے، جو چند باتیں میرے ذہن میں آئی ہیں، وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ شاید ان میں کوئی ایسی بات بھی ہو، جو آپ کی توجہ کی مستحق قرار پائے۔

غالب کی شاعری انیسویں صدی کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے لیکن اس کارنامے کی صحیح معنوں میں دریافت اور اس کی ادبی قدر و قیمت کے تعین کا سہرا بیسویں صدی کے سر ہے گو انیسویں صدی ہی میں مولانا حالی کی یادگار تالیف "یادگارِ غالب" وجود میں آ چکی تھی اس کی حیثیت غالب پر آئندہ ہونے والے کام کے مقدمے یا دیباچے کی سی ہے "یادگارِ غالب" لکھ کر دراصل مولانا حالی نے غالب کی شخصیت اور شاعری کو پہچاننے کا راستہ دکھایا ہے۔ بیسویں صدی نے مولانا حالی ہی کی رہنمائی میں غالب کو صحیح طور پر پہچانا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ مشرق کا یہ عظیم شاعر تذکروں کی محدود فضا میں مقید نہیں رہا، بلکہ اسے مستقل تصانیف کے موضوع کی حیثیت سے مشرق ہی میں نہیں، مغرب میں بھی پہچاننے کی کوشش کی گئی۔ اور یہ کوشش اب بھی جاری ہے۔

غالب کل تک صرف ہمارا شاعر تھا، آج وہ ساری دنیا کا شاعر ہے۔ اس میں غالب شناسوں کی کوشش کو لاکھ دخل سہی، لیکن خود غالب کے فکر و فن میں آفاقیت کا جو عنصر کارفرما ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ غالب کو کسی ایک خطے ایک ملک یا کسی ایک قوم تک محدود نہ کیا جائے۔ ہر بڑا فنکار زمان و مکان کا پابند ہوتے ہوئے بھی زمان و مکاں کی حدود توڑ کر ہر عہد اور ہر خطے میں یکساں طور پر مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ اور اب غالب کی مقبولیت بھی اسی منزل کے قریب آ پہنچی ہے۔ آج غالب کے جاننے والے صرف دہلی ڈھاکہ یا لاہور ہی میں نہیں، روس، فرانس

اٹلی، انگلستان، امریکہ، چیکوسلواکیہ اور نہ جانے دنیا کے کس کس حصے میں موجود ہیں۔ غالب کی اس مقبولیت کا جائزہ لیتے وقت اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ یہ مقبولیت محض غالب کے منتخب کلام کے تراجم کی وجہ سے ہے۔ جہاں تک معلوم ہے مغرب کی کسی زبان میں غالب کے پورے کلام کا ترجمہ نہیں ہوا۔ اور اسی وجہ سے عالمی سطح پر غالب صحیح قدر و قیمت متعین ہونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔

غالب کو عالمی سطح پر پوری طرح روشناس کرانے کے لیے سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ دنیا کی تمام اہم زبانوں میں غالب کے پورے کلام کے تراجم شائع کیے جائیں۔ یقیناً یہ بڑا کام ہے، اور اسی مناسبت سے خاصا مشکل بھی ہے۔ کوئی عالمی سطح کا ادارہ ہی اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر یونیسکو اس کام کی ذمہ داری سنبھال لے۔ اسکے وسائل اور مقاصد دونوں میں اتنی وسعت ہے کہ یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پا سکتا ہے۔ ابتداً کلام غالب کا انگریزی ترجمہ شائع کرنا مناسب ہوگا۔ اس کے بعد دوسری زبانوں میں تراجم کا راستہ خود بخود ہموار ہو جائے گا۔

کسی تخلیقی فن پارے کا ترجمہ کرنا یوں بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور جب معاملہ غالب جیسے شاعر کا ہو۔ جس کے یہاں تہ در تہ معانی سے بات پوری ہوتی ہے، تو یہ مشکل کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ کوئی ترجمہ بھی بہ تمام و کمال اصل کے قریب قریب ضرور پہنچ سکتا ہے، اور یہ بھی اس وقت ممکن ہے جب مترجم خود تخلیقی عمل کے پیچ در پیچ راستوں سے واقف ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ ترجمہ دریافت یا بازیافت ہی نہیں، تخلیق بھی ہے۔ مکمل کلام غالب کا انگریزی ترجمہ شائع ہونے کی صورت میں ممکن ہے۔ دوسرے اہل علم بھی اس کام کی طرف متوجہ ہوں، اور کیا تعجب، آگے چل کر غالب کو بھی ایک فٹز جیرلڈ مل جائے جو غالب کا مترجم نہیں، ترجمان بن کر غالب کے پیغام کی آفاقیت کو اجاگر کر دے۔

اسی سلسلے کا ایک اور کام یہ بھی ہے کہ غالب کے ادبی و فنی مرتبے کو عالمی ادبی معیاروں پر پرکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کلام غالب میں آفاقیت اور دوامیت کا جو عنصر ہے، وہ اسے ادب کے عالمی مشاہیر کے دوش بدوش کھڑا کرنے میں کہاں تک مدد دیتا ہے۔ اس کے لیے غالب اور دوسرے عالمی شہرت رکھنے والے فن کاروں کے تقابلی مطالعے کی ضرورت ہو گی۔ اگرچہ اس قسم کے مطالعوں کی منزل تراجم کے بعد آتی ہے، لیکن ایسے اہل علم کی کمی نہیں جو غالب کے ساتھ ساتھ بعض دوسری زبانوں کے مشاہیر ادب کے بارے میں گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ اس کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔

یہاں چند باتیں میں اردو کے محققین کی خدمت میں عرض کرنے کی جسارت کروں گا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہماری تحقیق کا بڑا حصہ غالب سے متعلق ہے جہاں اردو تحقیق نے غالب شناسی کا حق پوری طرح ادا کیا ہے، وہیں غالب کا یہ فیضان بھی کم نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے اردو کا تحقیقی سرمایہ مقدار اور معیار دونوں کے اعتبار سے خاصا وقیع ہے۔ ہمارے ممتاز محققین کی
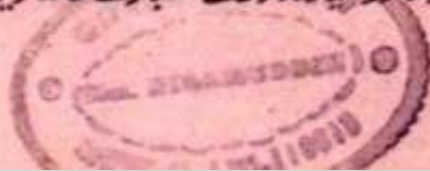
ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ غالبیات سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ غالب کے حالاتِ زندگی، متعلقہ شخصیات اور کلام کے بارے میں جس قسم کی تحقیق ہوئی، اس کی کوئی دوسری مثال ہمارے ہاں موجود نہیں ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے محققین میں سے بعض نے اپنی زندگیوں کا ایک بڑا حصّہ صرف کر کے، غالب کے ایک ایک لفظ پر پوری توجہ کی ہے، اور اس کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کا سراغ لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے، تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اس حوصلہ افزا صورتِ حال کے باوجود غالبیات کے بعض گوشے اہل علم و تحقیق کی توجہ کے مستحق ہیں۔ ان میں سے چند کے بارے میں میں کچھ مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے تو ایک ایسی لغت یا فرہنگ تیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں ہر وہ لفظ شامل کیا جائے جو غالب نے اپنی اردو اور فارسی نثر و نظم میں استعمال کیا ہو۔ ہر لفظ کے معنی دیئے جائیں اور اگر غالب نے اس لفظ کو نئے معنوں میں نئے انداز سے استعمال کیا ہو تو اس کی وضاحت بھی کی جائے۔ غالب کی شعری تراکیب کے بارے میں خاص طور پر تحقیق کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ ان میں سے کون کون سی ایسی تراکیب ہیں جو غالب سے پہلے کے شعرا کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس لغت یا فرہنگ کی تکمیل کے بعد تفہیم غالب کا مرحلہ بڑی حد تک آسان ہو جائے گا۔

دوسرا اہم کام ایک ایسی کتاب حوالہ کی تیاری ہے، جس میں غالب سے متعلق تمام شخصیات کے حالات زندگی ہوں اور غالب سے ان کے تعلق کی صراحت ہو۔ اس کام کو اس حد تک پھیلانا چاہیئے کہ غالب کی تحریروں میں جتنے اشخاص کے بھی نام آئے ہیں، خواہ وہ کسی زمانے کے ہوں، ان سب کے بارے میں بنیادی معلومات اس کتاب میں دی جائیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس جہت میں کچھ کام ہو چکا ہے۔ خصوصاً ہندوستان کے نامور محقق قاضی عبدالودود نے "جہان غالب" کے نام سے متعدد مقالے لکھے ہیں، اور کراچی کے "ادارۂ یادگار غالب" کی طرف سے بھی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے، لیکن ابھی اس موضوع پر کام کرنے کی مزید گنجائش ہے۔ خصوصاً غالب کے احباب اعزہ اور تلامذہ کے سلسلے میں حال ہی میں جو نیا مواد دستیاب ہوا ہے، اس کی روشنی میں اس کام کو وسیع پیمانے پر انجام دینے کی ضرورت ہے۔

غالب کی متعدد سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں، لیکن گزشتہ چند برسوں میں اور خصوصاً غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر جو نیا مواد سامنے آیا ہے، اس کے پیش نظر غالب کی ایک ایسی سوانح عمری کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے، جس میں غالب کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا از سر نو مطالعہ کر کے صاحب سوانح کی ایک ایسی تصویر پیش کی جائے جو اصل کے مطابق ہو۔ غالب کی نظم و نثر کے جو مخطوطے حال ہی میں دستیاب ہوئے ہیں، اُن سے حیات غالب کی بہت سی گم شدہ کڑیوں کا سراغ ملتا ہے۔ نیز سرکاری ریکارڈ سے حاصل کردہ بعض دستاویزات کی اشاعت سے بھی اہم امور سامنے آئے ہیں۔ ان سب نو دریافت مآخذ کی مدد سے حیات غالب کا از سر نو لکھا جانا نہایت ضروری ہے۔

تفہیمِ غالب ہی کے سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ غالبؔ نے اپنے جن پیشرو شعرا کے اثرات قبول کیے ہیں ان کی تفصیل سے وضاحت کی جائے، ہمارے نقادوں نے عموماً غالب کے اشعار کے مقابل پیش رو شعرا کے ہم معنی اشعار لکھ کر ان اثرات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری ناقص رائے میں اس قسم کی کوششیں غالب کے فکر کا پس منظر کی مکمل تصویر پیش نہیں کرتیں۔ غالب کے فکری و فنی ارتقا سے پوری طرح آگاہی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جن شعرا سے غالب نے استفادہ کیا ہے ان کے سرمائے کا جائزہ لیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ استفادے کی نوعیت کیا تھی۔

اسی طرح یہ کام بھی ضروری ہے کہ غالب کے بعد کے شعرا نے غالب سے جو اثرات قبول کیے ہیں، ان کا تنقیدی تجزیہ کیا جائے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ غالب کے تمام اہم شعرا بالواسطہ یا بلاواسطہ غالب سے بڑی حد تک متاثر ہیں، خصوصاً گزشتہ نصف صدی کے ادب پر تو غالب کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اسے بلا خوفِ تردید اثراتِ غالب کا عہد کہا جا سکتا ہے۔ اسی عہد سے اقبال جیسا عظیم فلسفی شاعر بھی تعلق رکھتا ہے، جس نے غالب کی عظمت کا اعتراف اپنی زبان ہی سے نہیں کیا بلکہ اپنے کلام میں بھی غالب کے اثرات کو قبول کر کے عظمتِ غالب کی ایک اہم دلیل پیش کی ہے۔ مختلف شعرا پر غالب کے اثرات کی وضاحت مختصر مقالوں کی صورت میں ہمارے نقاد دیتے رہے ہیں۔ لیکن اب یہ موضوع ایک مستقل کتاب کا تقاضا کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے صاحبانِ فکر و نظر اس تقاضے کو بحسن و خوبی پورا کریں گے۔

یہ اور اس قسم کے چند دوسرے کام میری رائے میں ایسے ہیں کہ جن کی انجام دہی نہایت ضروری ہے۔ مجھے یہ احساس ہے کہ اس قسم کے کام افراد سے زیادہ جماعتوں کے کرنے کے ہیں۔ اہلِ علم آپس میں تبادلۂ خیال کر کے ان کاموں کی تکمیل کے منصوبے تیار کر سکتے ہیں، اور پھر باہمی اشتراک سے ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ ان اہلِ علم کو حکومت اور مختلف علمی اداروں کا تعاون ہر حال ہونا چاہیے۔ میں انجمن ترقیٔ اردو کے صدر کی حیثیت سے یقین دلاتا ہوں کہ اگر اس قسم کے کسی منصوبے پر کام شروع کیا گیا تو انجمن ہر ممکن تعاون کرے گی۔

حضرات! میں نے غالب کے تعلق سے آپ کے سامنے جو کچھ عرض کیا ہے، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ غالب کے فکر و فن کی گہرائیوں کا اندازہ کرنے کے دوران غالب کے ایک عام قدردان کا نقطۂ نظر بھی آپ کے سامنے رہے، تاکہ آپ کے پرستاروں کو فکرِ غالب سے زیادہ سے زیادہ روشناس کرا سکیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اس مذاکرے کا افتتاح کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ یہ مذاکرہ غالب شناسی کے سلسلے میں ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔

خطبۂ صدارت

ڈاکٹر جسٹس ایس، اے رحمٰن

غالب کی یاد میں یہ تقریب پنجاب یونیورسٹی کے اہتمام اور یونیسکو کی اعانت سے منعقد ہو رہی ہے۔ بیرون ملک سے بعض فضلاء کی شرکت نے اس تقریب کو خاص اہمیت بخش دی ہے۔ فروری ۱۹۶۹ء مرزا غالب کی وفات پر سو برس کا عرصہ گزر چکا تھا برسی کے موقعہ پر مختلف ممالک میں اس عظیم شاعر کی یاد بود کے جلسے ہوئے۔ اس کی تصنیفات کے نئے ایڈیشن مرتب ہوئے۔ اس کے کلام پر تنقیدی اور تحسینی مقالات شائع ہوئے۔ شواہد کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ ابھی جاری رہے گا۔ اور کلام غالب کی اور بھی تفسیریں لکھی جائیں گی اور یوں اس نابغۂ شاعری کی پیش گوئی پوری ہو جائے گی کہ ؎

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کی اس عالمگیر مقبولیت کا راز کیا ہے؟ اس ضمن میں خیال غالب کے قول کی طرف جاتا ہے کہ شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں۔ مجموعی حیثیت سے کلام غالب اس مقولے کی صداقت کا مظہر ہے۔ شاید غالب کی معنی آفرینی ہی اس کے کلام کی ممتاز ترین خصوصیت ہے جو اس کو آفاقیت بخشتی ہے۔ اور اس کی زمان و مکان کی حدوں سے بے نیاز مقبولیت کی راہ ہموار کرتی ہے۔ اس نے مشاہداتی اور تخیلی حقیقتوں کو جمالیاتی سانچوں میں اس خوبصورتی سے انفرادی انداز سے ڈھالا کہ اکثر اوقات قاری کا ذوق و احساس پکار اٹھتے ہیں کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

غالب شناسوں کے لیئے اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ علامہ اقبال[2] مرحوم نے غالب کو پیکر بزم سخن کی روح سے تعبیر کرکے اسے خراج تحسین ادا کیا تھا اور گلشن ویمر میں خوابیدہ عظیم المانوی شاعر گوئٹے کا اسے ہم نوا ٹھہرایا تھا۔

غالب کی آفاقیت کا ایک عنصر اس کی انسانیاتی سطح پر وسیع المشربی ہے۔ وحدت الوجود کا شعورانہ نظریہ عمر غالب

کے اجتماعی ذخیرۂ فکر کا ایک ممتاز جزو تھا۔ غالباً اسی نظریے کے زیر اثر عربی طریق کا قائل اور عجمی نہاد غالب پکار اٹھتا ہے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اور پھر اس کے یہ شعر بھی قابلِ اعتنا ہیں :-

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں۔

تحلیل وتجزیہ کا طریقہ جمالیاتی تخلیقات کی قدر و قیمت کے تعین میں شاید زیادہ مفید نہیں ہوتا۔ لیکن عظیم شاعری جہاں جذبات میں ہل چل مچاتی ہے، وہاں دماغ کو بھی متاثر کرتی ہے کیونکہ فکری عنصر کے بغیر شاعری ان بلندیوں کو نہیں چھو سکتی۔ جہاں سے بقائے دوام کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اسی فکری عنصر کے جائزے سے ناقدانہ عمل کے لیئے بشیر مواد حاصل ہوتا ہے، گو کلام کا جمالیاتی پہلو بھی اپنا مقام اور اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ غالب کے کلام پر سرسری نگاہ ڈالیے تو اس کے یہاں زندگی کی لطافتوں اور حسن کائنات سے متمتع ہونے کی بھرپور خواہش ملتی ہے۔ اس کے شعور میں غم جاناں، غم روزگار اور غم کائنات کے ساتھ ساتھ تجسس آفاق و ماورائے آفاق کی سی کروٹیں لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان اشعار پر غور فرمایئے:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بجیب وصلہ نقد نشاط باید ریخت
بجان شکوہ تغافل طراز باید بود

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

نہیں نگار کو الفت نہ ہو، نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

پھر اس کے انداز بیان کی شوخی اور طرفگی، پامال ڈگر سے بچ کر نکلنے کی آرزو اور خود داری اور عزت نفس کا احساس اسے ایک منفرد مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار :-

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا۔

اس کا حکیمانہ انداز نظر اسے خونِ گرمِ دہقان میں بھی برق خرمن کا ہیولیٰ دکھاتا ہے اور تعمیر انسانی میں ایک خرابی کی مضمر صورت کی طرف اسکی رہنمائی کرکے، زندگی کی جمالیاتی حقیقتوں سے اس کو آشنا کرتا ہے۔ اس کی نگاہ بینی دل سنگ میں رقص بتان آذری کا مشاہدہ کرتی ہے۔ وہ آرزو کرتا ہے۔ کہ کاش اس کا مکان عرش سے ادھر ہوتا کہ وہ ایک بلندی پر اور منظر بناسکتا۔ غالب ہی کے بقول ع

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

کلام غالب بھی اک محشرستان خیال ہے۔ جس میں جنت نگاہ، جمالیاتی پیکر اور فردوس گوش نغمے خود رو پھولوں کی طرح ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاید حلقۂ دام خیال سے وابستگی غالب کو تنہائی کا احساس بھی دلاتی ہے۔ جس کے رشتے گاہے عشق مجازی سے اور گاہے دشت حقیقت میں انسانی انا کے بے جادہ و رہبر سفر سے مل جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کی "کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی" کی بغیر ان دونوں واسطوں سے کی جاسکتی ہے۔ اور یوں عصر حاضر کے دبستان وجودیت سے اسے کچھ مناسبت حاصل ہو جاتی ہے۔

میں نے سرسری کوشش سے بحر غالب سے چند موتی نکال کر پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ غالب کی پہلو دار شخصیت اور اس کے تہ در تہ شعور کے متعلق اور بھی کہنے کی باتیں ہیں لیکن اس مختصر خطبے میں ان کا احاطہ مشکل ہے۔ ان پر روشنی ڈالنے کا کام میں ان ماہرین غالب پر چھوڑتا ہوں جو بہ نفس نفیس اس مذاکرے کی رونق ہیں اور جو مجھ سے کہیں زیادہ اس وظیفے کے اہل ہیں۔

نظام اردو خطبات

غالب کی شخصیت اور شاعری

پروفیسر رشید احمد صدیقی

خطبۂ اوّل

غالب کی شخصیت

جناب صدر، خواتین و حضرات

دلّی مدتوں سے اردو کا آستانہ رہی ہے۔ خیال تو یہاں تک ہے کہ دہلی اردو کا وطن اور گہوارہ ہے۔ زبان کا تعلق دل سے ہے اور جس زبان و ادب میں ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے، اس کا تعلق ہندوستان کے دل یعنی دلّی سے ہونا فطری سا ہے پھر آپ کی یونیورسٹی نے اردو زبان کی جو مشاطگی کی ہے، وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ کم وقت میں، ایک نسبتاً کم عمر یونیورسٹی کے جواں سال شعبے کو اس طرح متعارف و ممتاز کرنا کہ ارباب ذوق کی نظریں اس پر پڑنے لگیں، آپ کا کارنامہ ہے جس کے لئے دہلی یونیورسٹی کا ارباب علم و اختیار لائق تہنیت ہیں۔ دہلی کا تعلق اردو سے بھی ہے اور غالب سے بھی یہ کم و بیش دونوں کا وطن ہے۔ اس لحاظ سے دہلی یونیورسٹی میں غالب شناسی کا یہ اقدام گویا غالب کے لفظوں میں ناخن کا قرض تھا جو اس طرح ادا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ دہلی یونیورسٹی میں اردو کا کام روز بروز توسیع پاتا اور ترقی کرتا رہے گا اور غالب کی وساطت سے یہ تعلق زیادہ گہرا، پائیدار اور وسیع تر ہوگا۔

آپ نے سنا ہوگا، بادشاہ منتخب کرنیکا کبھی یہ طریقہ بھی رہا ہے کہ دارالخلافت کے اکابر، استقبالیہ کمیٹی کی حیثیت سے منہ اندھیرے شہر پناہ کے دروازے پر جمع ہوتے اور پہلا جو شخص شہر میں داخل ہوتا اس کو اپنا بادشاہ قرار دے کر، مقررہ ماہی مراتب اور دھوم دھام کے ساتھ شہر میں لاتے، تاج و تخت اور اپنی عزت و عافیت اس کے سپرد کر دیتے۔ عجب نہیں جس منصب پر آج آپ نے مجھے سرفراز کیا ہے، اس میں اسی روایت کا احترام کیا گیا ہو۔ شاید اس فرق کے ساتھ کہ میری عزت و عافیت حاضرین و سامعین کے ہاتھ میں رہے گی۔ دوسرے یہ کہ توصیف و تحسین کے جن کلمات سے میرا تعارف کرایا گیا ہے ان سے دل خوش ہوا، اس لئے اور کہ اس سے پہلے اپنے بارے میں اتنی اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔

جس طرح کے بادشاہ کا ذکر کرتا ہوں، وہ کسی قانون یا رسم و روایت کا پابند نہیں ہوتا تھا اس لئے کہ ان سے وہ ناواقف ہوتا، کبھی کبھی ان کا مخالف بھی۔ مجھ سے بھی اس طرح کی باتیں سرزد ہوں تو پریشان نہ ہوجیے گا، پشیمان ہونے میں حرج نہیں۔ عقلمند آدمی اپنی برائی سنکر اتنا متفکر نہیں ہوتا جتنی اپنی تعریف سن کر۔ اس لئے کہ پہلی صورت میں بار ثبوت مدعی پر ہوتا ہے، دوسری میں ممدوح پر۔ یوں بھی میں اتنا عقلمند نہیں ہوں جتنا کہ اس نے اپنی تعریف سن کر اس وسوسے میں مبتلا ہوگیا ہوں کہ ایسا تو نہیں کہ آپ نے کلمات تحسین کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی ہو کہ میں ان کی تائید و توثیق موجودہ

ممتاز و منتخب اجتماع سے حاصل کروں۔ لیکن اس کا یقین اور اس لئے اطمینان ہے کہ نوجوان، بوڑھوں کو آزمائش میں نہیں مبتلا کرتے، ان کی آبرو کے امین و محافظ ہوتے ہیں۔

بہ نظر احتیاط یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آج کی گفتگو کے دو حصے ہیں۔ ایک غالب کی شخصیت دوسرا ان کی شاعری سے متعلق ہے۔ لیکن کہیں کہیں یہ خلط ملط ملیں تو عجب نہیں یہ قصور میرا ہے جس میں غالب کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ غالب پر سوچیے تو ان کا کلام اور ان کے کلام پر غور کیجیے تو غالب بن بلائے سامنے آجاتے ہیں۔ اچھے شاعر اور ان کے کلام کا حال کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ میرے طرز فکر کا بھی قصور ہو سکتا ہے جس طرح پیکر تراشی شعرا کا بہت بڑا ہنر ہے، اسی طرح شاعری میں شخص کو تلاش کرنا میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اسے آپ معاف فرمائیں یا نہیں، مجھے معذور ضرور سمجھیں۔

اس صدی کے شروع میں جن شعرا کے اشعار طوائفوں کے گانے اور شائستہ لوگوں کی زبان پر سب سے زیادہ آتے تھے، وہ داغ اور امیر تھے۔ شاعری کے عوامی نہیں عام پسند ہونے کی اس زمانے میں ایک پہچان یہ بھی تھی۔ اس نوع کی شاعری اس عہد کی عیش سامانی کے مطابق تھی۔ یوں بھی اس زمانے میں شاعری اور عاشقی زیادہ ہوتی تھی، جیسے آجکل شاعری زیادہ اور عاشقی کم ہوتی ہے۔ دمشق میں قحط پڑنے سے عاشقی فراموش ہوگئی تھی۔ ہمارے ہاں معلوم نہیں کیا کم ہونے پر شاعری کم ہونے لگے گی۔

داغ اور امیر کا یہ دور، طوائف اور تعلقے داروں کے ساتھ ختم ہوگیا۔ جدید ذہن کے بعض اکابر نے لکھنؤ میں غالب کو متعارف کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی، اس کا اثر بھی ہوا لیکن اتنا ہی جتنا کہ اس وقت کے لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمو کا نہیں تو نمود کا ہو سکتا تھا۔ اودھ پنچ نے تہذیب الاخلاق، سرسید اور حالی کے خلاف زبان اور شاعری کی میکانکی پرداخت اور حقائق سے گریز کا محاذ جس شد و مد سے قائم کیا تھا، وہ نئی زندگی کی صداقتوں کے سامنے خس و خاشاک کی دیوار کھڑی کرنے کی بے سود کوشش تھی۔ سرسید اور حالی نے اس یک طرفہ جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن زندگی اور ادب کے نئے تقاضوں کو پہچاننے اور ان سے عہدہ برآ ہونے میں جو کامیابی سرسید اور حالی کو ہوئی، وہ بڑی نمایاں اور نتیجہ خیز تھی۔ دوسری طرف جدید اردو جس کی ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوئی اور جو ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی دلی کالج تک پہنچی تھی، اس کو مؤثر و مقبول عام کرنے میں غالب کے خطوط، سرسید کے مضامین اور علی گڑھ تحریک کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہر بڑی تہذیب کے زوال پر نئے عہد کے کچھ مسائل سامنے آتے ہیں، مثلاً یہ کہ قدیم تہذیب میں کون سے اجزا یا عناصر ایسے ہیں جو نئے عہد کے مطالبات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو اس فشار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے مؤخر الذکر ختم ہو جاتے ہیں لیکن جن عوامل میں اس چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ اپنی گذشتہ افادیت اور اہمیت کو قائم رکھتے ہیں اور نئی تہذیب کے صحت مند اور فعّال عناصر کو پر و بال دیتے اور مہمیز کرتے ہیں۔ اس طور پر اگر ماضی کے صحیح و صالح عناصر و عوامل، حال کی دستگیری نہ کریں تو حال بے حال ہو جائے۔

غالب شناسی کا سلسلہ غالب کے دور ہی سے شروع ہوا اور اس قابل قدر سرمائے میں کوئی معقول اضافہ کرنا آسان نہیں ہے۔ حالی نے یادگار غالب لکھی، جس نے ارباب علم و فضل کو غالب کی شخصیت اور ان کے شعری و نثری کارناموں کی طرف متوجہ کیا۔ حالی نے یہ چراغ

کچھ ایسی نیک ساعت میں اور مبارک ہاتھوں سے روشن کیا تھا کہ اس کی لَو وقت کے ساتھ ساتھ تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کو اتنی اونچی محراب پر سجا دیا کہ سب کی نظریں حیرت اور مسرت سے اس کی طرف مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ انھوں نے مغرب کے اعلیٰ شعراء اور مفکرین کی صف میں غالب کو لا کھڑا کیا۔ ڈاکٹر سید محمود نے ان کو ایک محب وطن اور انقلاب پسند کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر عبداللطیف کے اختلافی حاشیوں کے ساتھ غالب شناسی کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ جن میں غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، مہیش پرشاد، مالک رام، امتیاز علی عرشی، خلیفہ عبدالحکیم اور دوسرے مستند مصنفین اور اہل قلم سامنے آتے ہیں۔ تنقید و تحقیق کا یہ کارواں برابر سرگرم سفر ہے۔ اسی طرح غالب کے اردو کلام کی شرح لکھنے والوں مثلاً حالی، نظم طباطبائی، حسرت موہانی، نظامی، بیخود دہلوی، سہا مجددی، جعفر علی خاں اثر، جوش ملسیانی، نیاز فتح پوری، آغا محمد باقر اور بے شمار دوسرے اکابر کے فکر و نظر سے ہم روشناس و مستفید ہوئے۔

خیال ہے کہ گذشتہ سو سال کے اندر غالب کے اردو کلام پر جتنی شرحیں لکھی گئیں، اتنی ہندوستان میں اردو یا فارسی کے کسی اور شاعر کے کلام پر تصنیف نہیں ہوئیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالب کے سمجھنے یا سمجھانے کا مطالبہ عوام اور خواص دونوں میں کتنا قوی رہا ہے۔ ہندوستان میں اردو کے اکابر فارسی شعرا کے کلام کو سمجھنے میں پڑھے لکھے لوگوں کو بالعموم زیادہ دقت نہیں ہوتی تھی۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ وہ فارسی کے کلاسیکی شعرا کے مقابلے میں غالب کے فارسی کلام کو زیادہ قابل اعتنا نہ سمجھتے ہوں۔ دشواری اس وقت محسوس ہوئی جب غالب نے فارسی کو اعلیٰ سطح پر براہ راست اور کثرت سے اردو شاعری میں داخل کر کے اس کو استوار و آراستہ کرنے اور نئی وسعتیں دینے کی کوشش شروع کر دی۔

اردو جاننے والوں کا عام طبقہ اس انداز کی شاعری کے سمجھنے سے معذور لیکن مشتاق تھا۔ دوسری طرف غالب کے اردو کلام سے آشنا گرویدہ ہو چکا تھا کہ ان کی فارسی آمیز شاعری کو بھی سمجھنے کا خواستگار رہا۔ اس لئے اردو کلام کی اتنی شرحیں لکھی گئیں اور غالب کے متفرق اشعار بھی معرض بحث میں آتے رہے۔ غالب سے روز بروز بڑھتی ہوئی عالمگیر عقیدت کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ غالب شناسی کا رجحان ترقی کرتا رہے گا۔

غالب ہماری تنقید و تحقیق کے لئے "مرد افگن عشق" کا درجہ رکھتے ہیں، جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمارے بہترین ذہنوں نے اپنی صلاحیتیں صرف کی ہیں۔ غالب شناسوں کی اس صف میں کیسے کیسے رفیقوں اور عزیزوں کے کیسے کیسے چہرے ہیں جن کے کارناموں کے شمار کے لئے اس مقالے کا دامن تنگ ہے۔ پھر اس پھول کی خوشبو کیسے کیسے دیار و امصار میں پھیلی! ذاکر صاحب نے مطبع شرکت کاویانی برلن سے دیوان غالب کے شاید اب تک سب سے خوبصورت پاکٹ ایڈیشن کی اشاعت کا انتظام کیا اور مشہور جرمن مصور نے وہ شہرۂ آفاق تصویر بنائی جو مدتوں تک غالب کی اصل شخصیت کی جگہ پُر کرتی رہی۔ مصوروں میں عبدالرحمٰن چغتائی نے ان کے اشعار کو مرقع کا پیرایہ دیا۔ ملک کے نامور موسیقاروں نے غالب کی غزلیں گائیں۔ غالب کی فلم تیار کی گئی اور مقبول ہوئی۔ شاعروں اور افسانہ نویسوں نے ان کے اشعار کو اپنے افسانہ و افسوں کا سرنامہ بنایا۔ اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر بھی غالب شناسی کی تحریک مقبول ہوتی رہی۔ ازبکستان سے لے کر دور دراز امریکہ تک غالب کی شہرت موج در موج پھیلتی چلی گئی۔ سو برس بعد بھی اس کی شاعری اور شخصیت کا جادو، سکۂ رائج الوقت ہے!

ہمارے ادب میں غالب اپنے ذہن اور ذوق کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ذہن کی خوبی کا معیار اس کی بیداری اور ہمہ گیر دسترس ہے۔ اس معیار سے غالب اور ان کے معاصرین کا جائزہ لیں تو غالب کی فوقیت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔ ذوق، ذہن کی تربیت کے مدارج کو ظاہر کرتا ہے۔ اس بارے میں غالب کی فضیلت اس بے نظیر خوش مذاقی اور خوش سلیقگی سے ظاہر ہوتی ہے جو ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ غالب کے غیر معمولی شخص اور شاعر ہونے کے بارے میں کون شبہ کر سکتا ہے جب اس کی گواہی دینے میں ان کے عہد کے تمام معتبر و محترم اشخاص ہم زبان ہیں۔ اعلیٰ ذہن، ذوق اور ظرف کا جتنا متنوع ہم آہنگ اور حسین امتزاج غالب کے یہاں ملتا ہے وہ باستثناء اقبال ہمارے کسی اور شاعر یا ادیب کے حصے میں نہیں آیا۔ ان کی شخصیت اور شاعری، ہماری تہذیبی زندگی کا ایسا سرچشمہ ہے جو اعلیٰ تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کی مسلسل آبیاری کرتا رہے گا۔ اس کی شہادت اس کام سے ملتی ہے جو اب تک غالب پر ہوا ہے جس کی بنا پر ہمارے شعر و ادب میں غالبیات کو ایک مستقل مطالعے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ جس کی نوعیت اور رفتار کو دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ باقاعدہ تدوین و تحشیے کے لئے مستند ارباب فکر و فن کی مدد سے اور مشورے سے ایک جامع منصوبہ تیار کیا جائے۔

اس سلسلے میں آپ کی توجہ A COMPANION TO SHAKESPEARS STUDIES کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ۱۹۳۴ء میں انگلستان میں شائع ہوئی تھی جس میں شیکسپیئر سے متعلق مستند کاموں کی نہایت عالمانہ اور ماہرانہ تلخیص و تشریح پیش کی گئی ہے جس نے شیکسپیئر کا مطالعہ کرنے والوں کی رہنمائی میں بیش بہا مدد دی۔ ہمارے یہاں غالب اور اقبال پر اس قسم کی کتاب کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام نہایت امید و اعتماد کے ساتھ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سپرد کر سکتے ہیں جس کے لائق صدر اور اراکین نے اردو میں علمی اور ادبی کاموں کا نہایت اعلےٰ اور امید افزا معیار قائم کیا ہے

غالب کے سوچنے اور کہنے کا انداز اس وقت کی اردو شاعری کی روایات سے علیحدہ اجنبی اور بلند تھا۔ وہ جو کچھ سوچتے تھے یا جس طرح سوچتے تھے اسلامی نہ تھا جتنا عجمی عقیدے اور ذہن دونوں اعتبار سے وہ عجمی کے اتنے قائل نہیں معلوم ہوتے تھے جتنے عجم کے۔ ان کا انسان اقبال کا انسان تھا نہ نیٹشے کا۔ وہ کلیتہً غالب کا تھا اور غالب اپنے ہر قول و فعل کا جواز "آدم زادہ ام" میں نہ صرف ڈھونڈتے تھے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے تھے۔ کہتے ہیں:

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام   آشکارا دم زعصیاں می زنم

غالب کا انسان جتنا ذہن اور جسم کا تھا، اتنا اخلاق و کردار کا نہ تھا اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ زندگی پر ان کی نظر کیا تھی اور کہاں تک تھی۔ زندگی سے جہاں تہاں جو نا آسودگی ان کے یہاں ملتی ہے، کیا عجب اس میں اس رجحان کو بھی دخل ہو۔ آسودگی اور رد و تفاخر تو صرف اقرار و یقین کی زندگی میں میسر آتا ہے۔

سنا جاتا ہے کہ عقل یا علم کی دیوی اتھینہ، یونان کے اولمپس نشین خدا زیوس کے سر سے دفعۃً جست کر کے برآمد ہو گئی تھی۔ اس کے بعد یہ نہ معلوم ہو سکا کہ زیوس کی عقل یا علم کتنا باقی رہ گیا تھا یا ایک خاتون کا بار اتر جانے سے زیوس نے کیا محسوس کیا۔ اس کا بھی پتہ نہ

لگ سکا کہ اس حادثے کے بعد زیوس اولمپس میں خانہ نشین ہو گئے تھے یا پہلے سے تھے۔ یہ بہت دنوں کی بات ہے۔ اب یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ علم و عقل ہی نہیں بلکہ شاعری کی دیوی دیویاں بھی ایسے لوگوں کے سر سے مستقل برآمد ہوتی رہتی ہیں جن کے لئے نہ تو زیوس ہونے کی شرط ہے نہ آئینہ کی۔ غالب کے زمانے میں نہ ایسے زیوس تھے نہ منروا یا آئینہ۔ بلکہ شاعری اور شخصیت دونوں کو ابھارنے، سدھارنے اور سنوارنے میں کافی ریاض کرنا پڑتا تھا۔ غالب کو خاص طور پر اس عمل سے گزرنا پڑتا۔ اس لئے کہ جیسی کاواک شاعری سے انھوں نے ابتدا کی تھی اور کچھ دنوں اس میں اسیر رہے۔ اس سے بالکل مختلف نوعیت کی شاعری کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑا جس کا انھوں نے بڑی صاف دلی سے اعتراف کیا ہے۔ اس وقت کی دِلّی، تہذیبی و ثقافتی معاملات میں کسی آزاد روی یا بے راہ روی کو گوارہ نہیں کر سکتی تھی۔ حکومت کی ساکھ جتنی گر گئی تھی ثقافت اتنی ہی بڑھ گئی تھی۔ ہر عظیم تہذیب کے زوال میں یہ کرشمہ نظر آئے گا جو بڑا ہی سخت گیر ہوتا ہے۔ غالب کو ان حالات سے اپنے کو سازگار کرنا پڑا ان کی جینیس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے صورت حال کو پہچانا اور اپنی شاعری صلاحیت کو وہ رنگ و رخ دیا اور ایسی کامیابی حاصل کی کہ ان کے اولین اور سب سے مستند مورخ حالی کو لکھنا پڑا "ان کی شاعری اور انشاپردازی نے ان کی لائف کو دار الخلافہ کے اخیر دور کا ایک اہم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا اور اردو نثر و نظم پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے۔"

غالب کی طفولیت اور عنفوان شباب کا زمانہ آگرہ میں گذرا جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا لیکن اس کی وجہ سے ان کو زندگی کی کوئی سختی یا محرومی جھیلنی نہیں پڑی۔ ان کی یتیمی پر بعض اہل نظر نے جن نفسیاتی اصولوں کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کیا ہے، ان اصولوں کے بجائے خود صحیح ہونے میں کلام نہیں لیکن ان کا غالب کے شعور پر اس طرح اثر انداز ہونا کہ وہ احساس کمتری، نرگسیت، خود بینی، خود نمائی یا دوسری نفسیاتی ژولیدگیوں کے شکار ہو گئے، درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس زمانے میں شریف و آسودہ حال گھرانوں کے لڑکے تفریح و تعیش کے جس ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے، اس کا غالب کو بھی بہرہ وافر ملا تھا۔ اس عہد کا ذکر غالب نے جس طرح کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے تلخ و ترش کا کیا ذکر، انھوں نے اعتدال سے زیادہ عیش کوشی میں حصہ لیا۔ مہر نیمروز میں انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ نعت میں ایک قصیدہ کہا ہے، جس میں ابتدائی عہد کے عیش و طرب کی جھلکیاں ملتی ہیں:

آن بلبلم کہ در چمنستان بشاخسار	بود آشیان من شکن طرۂ بہار
ہر غنچہ از دلم بفضائے شگفتگی	فیض نسیم جلوۂ گل داشت پیش کار
ہموارہ ذوق و مستی و لہو و سرود و سوز	پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار
بختم بجیب عشرتیاں می فشاند گل	سعیم ز پائے محنتیاں می کشید خار
وقت مرا روانی کوثر در آستین	بزم مرا طراوت فردوس در کنار

اس کے رد عمل کو یوں بیان کرتے ہیں،

اکنوں ستم کہ رنگ بروئیم نمی رسد — تا رخ بہ خونِ دیدہ نشوئیم ہزار بار
خو کردنم بوحشتِ شبہائے بیکسی — برد از ضمیر دہشتِ تاریکیٔ مزار

ڈرامائی انداز و اثر کے اعتبار سے غالب کے بے مثل اردو قطعے "اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" سے میگوا کتنا ملتا جلتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کنٹراسٹ یا اختلافِ احوال کی مصوری میں غالب کو موقع و موسیقی کو کام میں لانے پر کتنی غیر معمولی قدرت تھی آگے چل کر کہتے ہیں: آہ زعمرے کہ گذشت ایں چنیں۔ یا یہ بیان کر میں نے ایام دبستاں نشینی میں شرح مأتہ عامل تک پڑھا بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور اور عیش و عشرت میں مبتلا ہو گیا۔ ایسے یتیم کو اپنے یتیم ہونے کا احساس بمشکل ہو سکتا ہے اور محض یتیم ہونے کی بنا پر وہ کسی نفسیاتی عارضے کا شکار نہیں ہو سکتا۔

غالب کو جس نے غالب بنایا، وہ آگرہ نہیں مو بلی ہے۔ اس وقت کی دلّی میں افراد اور ادارے تہذیب کا درجہ رکھتے تھے۔ یہاں آنے کے بعد ان کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑا، وہی ان کی سیرت و شخصیت کے بنانے میں مستقل طور پر معین ہوئے۔ گو اس عمل میں قلم سرنوشت کے حروف یا سیر مے قطرے لگنے کو بھی کچھ کم دخل نہیں ہوتا۔ دہلی میں ان کی شادی کمسنی میں ایک شریف اور کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی۔ ازدواجی زندگی راس آئی ہو یا نہیں، دہلی میں ان کی شاعری نے صحیح سمت و سطح پائی۔ آگرہ میں ان کی زندگی جن بے عنوانیوں میں گزری تھی، ان کی بہت کچھ اصلاح دہلی میں ہو گئی۔ آگرہ میں نہ ایسے شخص تھے نہ ادارے جو غالب کی جینیس کو پہچانتے اور اس کو تربیت دے سکتے۔ یہ زمانہ دہلی کے تہذیبی عروج اور سیاسی زوال کا تھا جو قوموں کی زندگی میں بڑا اہم ہوتا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

غالب دہلی پہنچے تو اسے ایک عظیم تہذیب کے نمائندوں اور نمونوں کا معمور پایا جن کے فیض و فن سے اس کے بام و در منور تھے ان میں سب سے زیادہ وقعت قلعۂ معلّی اور اس کی ان گرانمایہ روایات کی تھی جو اس کے سب سے زیادہ بے دست و پا اور قابلِ رحم حکمران کے منصب کو حاصل تھی۔ مشائخین میں شاہ غلام علی، مولانا احمد فخر الدین، حضرت سید احمد، مولانا محمد فخر الدین، حکما میں حکیم احسن اللہ خاں، حکیم صادق علی خاں، حکیم حسن محمد خاں، حکیم غلام نجف خاں۔ علمائے دین میں شاہ عبد العزیز، مولانا محمد صدر الدین خاں، مولانا فضل حق، شاہ رفیع الدین، مولانا محمد اسمٰعیل، مولانا نذیر حسین۔ شعرا میں نواب محمد ضیاء الدین احمد خاں رخشاں و نیّر، میر نظام الدین ممنون، شاہ نصیر، ذوق، عارف، مومن، صہبائی، شیفتہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ کتنی درگاہیں، آستانے اور سجادے تھے۔ ان کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ یہ اشخاص اور ادارے دلّی کے مخصوص و گرانقدر معیارِ اخلاق و اقدار کے نگران و نگہبان تھے اور اپنی اپنی جگہ پر سوسائٹی کے وزن و وقار کو اس سے کہیں زیادہ قوت و اعتماد کے ساتھ سنبھالے ہوئے تھے جو آج کل کے اعلیٰ سے اعلیٰ علمی، تعلیمی، مذہبی اداروں، طرح طرح کی تہذیبی انجمنوں، علمی مذاکروں، اخبار و رسائل، ایوان ہائے حکومت، حتیٰ کہ پولیس سے بھی نہیں بن پڑتے یہ ضرور ہے کہ اس وقت کی دہلی کے مقابلے میں آجکل کی دہلی کہیں زیادہ بے کراں و بے اماں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہر عہد کی طرح

یہ عہد بھی اپنے طوفانوں کے ساتھ اپنے الیاس و خضر کیوں نہیں لاتا۔

مغرب کی ہوائیں اپنے ساتھ سائنس، صنعت، ٹکنالوجی، حکمرانی اور حکمبرداری کے نئے نئے تصورات لائیں۔ مذہب و اخلاق کے صحیفوں کی نئے سرے سے ورق گردانی کی جانے لگی۔ نئی صداقتیں نئے چیلنج لائیں، نئی آرزوں نے انسان و انسانیت کے فروغ کیلئے نئی شمعیں روشن کیں اور نئے افق دریافت کئے۔ احیائے علوم اور اصلاح دین کی تحریکوں نے مغرب کو جو ولولۂ تازہ دیا تھا جس سے وہ دنیا کا معلم جدید قرار پایا، اس کی حرکت و حرارت ہندوستان تک پہنچی۔ شاہ ولی اللہ سے سرسید تک مذہب و معاشرت کے تصور میں جو تبدیلیاں راہ پاتی رہیں، وہ آزادئ افکار کی ان ہی گیتی نورد تحریکوں کا پرتو ہیں۔ انگریزی حکومت نے افراد اور جماعت کو جان و مال و آبرو کے تحفظ و ترقی کی ضمانت دی جن سے وہ مدتوں سے محروم تھے۔ اس کے ساتھ مغربی اداروں، مغربی فکر و عمل اور مغربی نظم و نسق سے ہندوستان کو روشناس کرایا۔ انگریزی عمل دخل نے جہاں ہندوستان کو بہت سی خام خیالیوں سے نجات دلائی، وہاں اس کی خام پیداوار اور برائے نام مزدوری سے اپنے ملک کے کاروبار کو اس طرح فروغ دیا کہ صنعتی انقلاب اپنی اہمیت کے اعتبار سے اصلاح دین اور احیائے علوم کی تحریکوں سے کمتر نہ رہا بلکہ یہاں تک کہنا صحیح ہوگا کہ یہ تینوں تحریکیں ایک دوسرے کی معاون ہی نہیں ایک دوسرے کا منطقی نتیجہ ہیں۔

اس زمانے میں جتنے چھوٹے بڑے انگریز حکام ہندوستان آتے تھے، ان میں بیشتر نہ صرف انصرام حکومت میں پورا درک رکھتے تھے بلکہ صاحب علم و فن بھی ہوتے، بالخصوص علوم مشرقیہ میں۔ وہ جتنے حاکم ہوتے اس سے کم عالم نہ ہوتے۔ انگلستان کے اکابر اس سے واقف تھے کہ ان کو ہندوستان کی بدنظمی ہی کو نہیں دیکھنا تھا بلکہ وہاں کے اکابر علم و فن کا بھی سامنا کرنا تھا اعلیٰ علمی سطح پر قدیم و جدید کو ایک دوسرے سے متعارف کرنے میں اس عہد کے علم دوست انگریز حکام کا ہندوستان پر بڑا احسان ہے۔ غالب کا ان سے کسی نہ کسی سطح پر ساتھ رہا۔ غالب سے پہلے اردو شاعر کے سامنے فارسی شاعری کی اتنی روح نہ تھی جتنی اس کی روایت اور رواج۔ اردو شعراء فارسی شاعری کی ٹیکنک اور دروبست سے بخوبی واقف تھے۔ اس کو صحت و صفائی سے برتتے اور اس پر اصرار کرتے۔ دہلی میں غالب کو خاندانی املاک اور وراثت کے جھگڑوں کا سامنا ہوا پنشن کا استغاثہ لیکر لکھنؤ کانپور، الہ آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ اس سفر میں جہاں تک لکھنؤ جانے کا تعلق تھا کشش کاف کرم، کا بھی شائبہ تھا۔ کلکتہ میں انگریزی اور ایرانی ارباب علم سے تعارف ہوا جنھوں نے اپنی وسعتِ نظر، علم و فن میں دسترس اور معارف پروری سے غالب کو متاثر کیا ہوگا۔ وہاں کے مشاعروں میں غالب کو اس آویزش سے سابقہ ہوا جو زبان داں اور اہل زبان میں ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ فارسی کے ہندی نژاد ہنرمندوں کے "غوغائے شبیخونے" کی زد میں آ گئے۔ مخالفوں نے ان کو قواعد اور لغت کے چرخ پر رکھ لیا۔ یہ بھتے تھے کہ بتوں کی طرح زبان بھی ہزار شیوہ ہوتی ہے جس کو اب تک کوئی نام نہیں دیا جاسکا ہے۔ چنانچہ اس عہد کے کلکتہ میں ان کو نقد و نظر کے مسائل میں وہی پیش آیا جو آجکل کے کلکتہ کے نظم و نسق میں حکومت وقت کو پیش آتا رہتا ہے۔ کلکتہ میں غالب کے مخالف اور موید دونوں تھے۔ کچھ دنوں مقابلہ کرتے رہے، بالآخر کنارہ کش ہو جانے میں مصلحت دیکھی۔ معذرت میں مثنوی بادِ مخالف لکھی۔ فریقین ختم ہو گئے لیکن ایک بڑے شاعر کا پیچ و تاب، درد و درماندگی، راست گوئی اور معذرت خواہی اس کے کارناموں میں کس طرح زندہ رہتی ہے، اس کی مثال یہ مثنوی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے سخن پروران کلکتہ　　　وے زباں آوران کلکتہ

اے رئیسان ایں سوادِ عظیم　　　وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم

اسد اللہ بخت برگشتہ ۱ — در غم و پیچ عجز سرگشتہ

گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست — بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست

ذوقِ شعر و سخن کجاست مرا! — کے زبانِ سخن سزاست مرا

گردشِ روزگارِ خویشتنم؛ — حیرتِ کاروبارِ خویشتنم

بر غریباں کجا رواست ستم — رحم اگر نیست خود چراست ستم

دامن از کف کنم چگونہ رہا — طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روح و روانِ معنیٰ را — آن ظہوری جہانِ معنی را

آن کہ طے کردہ این مواقف را — چہ شناسد قتیل و واقف را

دل و جانم فدائے احباب است — شوق وقفِ رضائے احباب است

می شوم خویش را بہ صلح دلیل — می سرایم نوائے مدحِ قتیل

گرچہ ایرانیش نخواہم گفت — سعدیِ ثانیش نخواہم گفت

لیکن از من ہزار بار بہ است — از من و ہمچو من ہزار بہ است

من کفِ خاک و او سپہرِ بلند — خاک را کے رسد بہ چرخ کمند

مرحبا سازِ خوش بیانیٔ او — حبذا شورِ نکتہ دانیٔ او

نظمش آبِ حیات را ماند — در روانی فرات را ماند

نثرِ او نقشِ بالِ طاؤس است — انتخابِ صراح و قاموس است

آخر میں کہتے ہیں۔

رحم بر ما و بے گناہی ما

اس آشتی نامے پر جھگڑا ختم ہوگیا۔ غالب نے معذرت تو کرلی لیکن اپنا موقف نہیں بدلا۔ چنانچہ مثنوی میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ اس چیلنج سے کم اشتعال انگیز نہیں ہے۔ جس سے مناقشے کی ابتدا ہوئی ہوگی تقریباً چالیس سال بعد مرزا نے قاطع برہان لکھی جس میں برہان قاطع پر گرفت کی گئی تھی۔ اس پر بھی فتنہ برپا ہوا۔ خیال یہ ہے کہ غالب جیسے غیر معمولی تخلیقی شاعر کو تحقیق کے میدان میں نہیں اترنا چاہیے تھا۔ لغت، الفاظ، محاورہ وغیرہ کی وادی شاعری کی جولانگاہ سے مختلف ہے۔ لغت میں تخیل کام نہیں دیتی، تفتیش درکار ہوتی ہے۔ لغت نویس بڑی چھان بین، مختلف و متعدد لغات، علم زبان کے اصولوں اور الفاظ کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کو سامنے رکھ کر حکم لگاتا ہے۔ اس نوعیت کے مسائل میں اہل زبان ہونا اتنا کام نہیں دیتا جتنا زبان کا محقق و مبصر ہونا۔ خیال تو یہاں تک ہے کہ اگر لغت کے معاملے میں زبان داں نہیں اہل زبان کو اختیارات دے دئے جائیں تو زبان و ادب میں آئے دن انتشار و خلفشار کا سامنا ہونے لگے۔ لغت کے کاملین اکثر و بیشتر غیر اہل زبان ہوتے ہیں۔ عدلیہ کو انتظامیہ یعنی جوڈیشری

کو ایگزیکٹو سے علیحدہ رکھنے میں اسی طرح کی کچھ مصلحت رکھی گئی ہے۔

غالب کا کلکتے کا سفر پنشن کی بازیافت میں راس نہ آیا لیکن وہاں ان کو "خانی کشتیوں" "سبزۂ زارِ مطرا" "نازنین بتانِ خود آرا" "میوہ ہائے تازہ و شیریں" اور "بادہ ہائے ناب و گوارا" سے آشنا ہونے کا موقع ملا، جس سے وہ بہت مسرور و متاثر ہوئے۔ اس زمانے میں انگریز اور انگریزی حکومت کے دو بڑے اہم مراکز کلکتہ اور دہلی تھے۔ غالب کا ان سے براہ راست سابقہ رہا۔ اس وقت تک غالباً کسی دوسرے معروف اردو شاعر نے غالب کی طرح دور و دراز اہم مقامات کا سفر نہیں کیا تھا اور زندگی و زمانہ کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے دو چار نہیں ہوا تھا۔ سر سید نے آئینِ اکبری کو مدوّن کیا تو غالب سے تقریظ لکھنے کی فرمائش کی جسے موخرالذکر نے اس فہمائش کے ساتھ پورا کیا "مردہ پروردن مبارک کار نیست" کہتے ہیں:

کس نمی باشد بگیتی ایں متاع	خواجہ را چہ بود امید انتفاع
صاحبانِ انگلستان را نگر	شیوۂ و انداز اینان را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند	آنچہ ہرگز کس ندیدہ آوردہ اند
داد و دانش را بہم پیوستہ اند	ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
از دخان زورق بہ رفتار آمدہ	باد و موج این ہر دو بے کار آمدہ
نغمہ ہائے زخمہ از ساز آوردند	حرف چوں طائر بہ پرواز آوردند

غالب کی شخصیت کو سمجھنے میں سہولت ہوگی اگر ہم تعصب یا خوش عقیدگی سے علیحدہ اور بلند ہو کر ان کی ذہنی پرداخت کا جائزہ لیں۔ ان کو اپنے نسب پر بڑا فخر تھا جس کا برابر اظہار و اعلان کرتے رہتے لیکن زمانہ سازگار نہ ہوا۔ باوجود کوشش کے دہلی میں اس معیارِ زندگی تک نہ پہنچ پائے جس کا دہلی کے اکابر کے ساتھ وہ اپنے کو مستحق سمجھتے تھے۔ یہ محرومی ان کی سیرت و شاعری پر اثر انداز ہوئی، سیرت پر زیادہ، شاعری پر کم۔ ان کی شاعری میں وہی تب و تاب اور فکر و فرزانگی ملتی ہے جو کلاسیکی شاعروں کا امتیاز ہے لیکن یہ بات ان کی سیرت و شخصیت کے بارے میں وثوق سے نہیں کہی جا سکتی جس میں وہ صلابت نہیں ملتی جو سپہ گری کی اولین صفت ہے اور جسے غالب اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں، چنانچہ انھوں نے اپنا راستہ علیحدہ نکالا جنیئس یوں بھی روشِ عام سے ہمیشہ علیحدہ رہی ہے۔ غالب کے غیر معمولی جنیئس ہونے میں کلام نہیں۔ اس طرح ان کی علیحدگی کا رجحان بھی معمول سے بڑھا ہوا تھا۔ ایک جگہ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں۔

فرسودہ رسم ہائے عزیزان فروگذار	در سور نوحہ خواں و بہ بزمِ عزا برقص

غالب طبعاً عجمی تھے، مسلمان، موحد، صوفی سب بعد میں۔ انھوں نے حمد، نعت و منقبت میں عقیدت کے جو ہدیے پیش کئے ہیں ان سے انکار نہیں لیکن ان کی شخصیت کا یہ پہلو جتنا انقیاد و طاعت کا ہے، اتنا فکر و تخیل کی بلندی و برنائی اور عرفان و یقین کا نہیں ہے۔ وہ شاعر اور شخص دونوں اعتبار سے عجمی ہیں۔ عجم کے یزدان و اہرمن، لہراسپ و جاماسپ، جام و جمشید، آتشکدوں اور لالہ زاروں اور ان سب کے رسم و روایات کی رو سے۔ اس کا سراغ ان کے اردو کلام یا خطوط میں اتنا نہیں جتنا فارسی کلام میں ملتا ہے۔ غالب کے

عجمی نہاد ہونے کی تائید میں ان کے اعترافات ملاحظہ ہوں۔

بود غالب عندلیبے از گلستانِ عجم — من ز غفلت طوطیِ ہندوستان نامیدمش

غالب ز ہند نیست نوائے کہ میکشم — گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ۔ ما

درمن ہوس بادہ طبیعیت کہ غالب — پیمانہ بہ جمشید رساند نسبم را

ناداں حریفِ مستیٔ غالب مشو کہ او — دُردی کشِ پیالۂ جمشید بودہ است

لہراسپ کجا رفتی و پرویز کجائی — آتش کدہ ویرانہ و میخانہ خرابست

ساقی نامے کے دو اشعار سنئے:

بیا ساقی آئین جشم تازہ کن — طرازِ بساطِ کرم تازہ کن

بہ پرویز از مے درودے فرست — بہ بہرام از نے سرودے فرست

کہتے ہیں:

رموزِ دیں نہ شناسم، درست و معذورم — نہادِ من عجمی و طریقِ من عربیست!

غالب کے کلام میں آتش نفسی کی جو ایک زیریں لَے ملتی ہے، وہ بھی آتشکدۂ ایران کا تصرف ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

دلم معبودِ زردشتست غالب فاش میگویم — بہ خس یعنی قلم من دادہ ام آذر فشانی را

ساز و قدح و نغمہ و صہبا ہمہ آتش — یابی ز سمندر رہ و بزم طریم را

شرارِ آتشِ زردشت در نہادم بود — کہ ہم بداغِ مغاں شیوہ و براہم سوخت

از آتشِ لہراسپ نشاں می دہد امروز — سوزے کہ بجا کم ز تو در عظم رمیم است

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ — چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

سینہ بکشودیم و خلقے دید کانجا آتش است
بعد ازیں گویند آتش را کہ گویا آتش است

اردو میں بھی اس سوز دروں کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں لیکن نسبتہً کم۔ غالب اپنے فارسی نژاد اور عجمی نہاد ہونے کا اظہار جس کثرت اور جس واضح طریق پر اپنے فارسی کلام میں کرتے ہیں، اردو میں نہیں کرتے، اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ اردو میں وہ اُس مسلک، اُس فضا، شعری روایات اور معاشری مقتضیات کا لحاظ کرتے ہوں جو دہلی میں مقبول تھے لیکن فارسی میں ان کا ذہن قدیم ایران کی طرف بے اختیار منتقل ہو جاتا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ دہلی میں زندگی اور زمانے کو اپنے معیار یا اپنے مقاصد کے مطابق نہ پا کر انھوں نے عجم میں پناہ لی ہو۔

ان وجوہ سے میں غالب کے فارسی کلام کو جس میں غزل قصیدہ، مثنوی سب شامل ہیں بحیثیت مجموعی اردو کلام سے زیادہ ان کا نمائندہ سمجھتا ہوں۔ اس سے یہ کہنا مقصود نہیں ہے کہ غالب کا اردو کلام ان کے فارسی کلام کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کی جو

عظمت ہے اور جس عالمگیر پیمانے پر آج اس کا اعتراف کیا جا رہا ہے وہ تمام تر ان کی اعلیٰ اردو شاعری کی بنا پر ہے۔ اپنے اردو کلام کا اعتراف خود غالب نے کیا ہے اور اسی ادعا کے ساتھ جس سے کبھی وقت انھوں نے اپنے مجموعۂ اردو کو بے رنگِ من است بتایا تھا۔ کلام کو نمائندہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے اعتقاد و افکار اور ذہن و ذوق کی جو ترجمانی اور زور بیان و روانیٔ طبع کے جیسے نمونے ان کے فارسی کلام میں ملتے ہیں وہ ان کے اردو کلام میں کم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک انسان و کائنات کے روابط و رموز تک رسائی اور ان کی بے مثل باز آفرینی کا تعلق ہے، غالب کا شمار دنیا کے منتخب شاعروں میں ہوگا۔ لیکن اکثر دنیوی امور میں ان کے بیانات اور طرزِ عمل کو عقیدت کے سائے میں نہیں، عقل کی روشنی میں پرکھنا بہتر ہوگا۔ بایں ہمہ ان کے وسیع المشرب اور انسان دوست ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کے کلام میں ان کے یا کسی اور عہد کی تصویر یا ترجمانی ملتی ہے۔ اس طرح کی ذمہ داری غزل نہ پسند کرتی ہے نہ قبول۔ وہ نہ اخبار ہوتی ہے نہ تاریخ یا تذکرہ۔ اس میں باطن کے احوال کی مصوری ملتی ہے جن کو اچھا شاعر اپنی شخصیت میں ڈھال کر، اس ادائے خاص سے پیش کرتا ہے کہ سامع کو وہ اپنے احوال معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہی شاعر کا کمال اور اس کی شاعری کا اعجاز ہے۔ اچھی غزل وہ ہے جس کے بیشتر اشعار حسنِ خیال، حسن معانی اور حسن بیان کے اعتبار سے ضرب المثل بن جائیں یا بن جانے کی ان میں صلاحیت ہو سہل ممتنع کا ایک تصور یہ بھی ہے۔ اسی معیار کو پیش نظر رکھ کر میں نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ ایک دلچسپ خیال اکثر آتا رہتا ہے کہ اگر ہندوستان کی دوسری زبانیں اپنی اپنی جینیس، روش و روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے غزل کو اپنائیں تو ان زبانوں کے حق میں کیسا ہوگا۔ کیا غزل ان زبانوں میں اپنی کم سے کم خصوصیات کو بحال رکھ کر ان کے حسن اور قبول عام میں کوئی اضافہ کر سکے گی۔ یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ عام ذہنوں پر اردو کی جیسی غیر معمولی گرفت ہے، اس میں غزل کا سب سے گرانقدر حصہ ہے۔ اس لئے ہندوستان کی دوسری زبانوں بالخصوص ہندی کو چاہیے کہ وہ غزل کو اپنانے میں ہچکچائے نہیں بلکہ ہمت اور ہنرمندی سے کام لے۔

اس میں شک نہیں اگر غالب نے اردو میں شاعری نہ کی ہوتی تو شاید ہم اس احترام و عقیدت کے ساتھ ان کی فارسی شاعری کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جتنے کہ ہوئے۔ غالب اور اقبال نے اردو کو فارسی سے اس طرح ہم آہنگ کیا اور ربط دیا ہے کہ اردو میں جب کوئی بڑا شاعر کسی بڑے موضوع پر سوچنے اور کہنے کے لئے آمادہ ہوگا تو اس کو توانائی، زیبائی اور اثر آفرینی کے لئے فارسی کے نوع بہ نوع ذخائر سے استفادہ کرنا پڑے گا۔ عظیم زبانوں کے کارواں کے ساتھ اردو شعر و ادب اب تاریخ اور انشا کے بنائے ہوئے پالنے یا پالکی میں نہیں بلکہ غالب اور اقبال کی قیادت و رفاقت میں سرگرم سفر ہوگا۔

کلکتے سے واپسی پر بقیہ تمام عمر دہلی میں بسر ہوئی۔ زندگی کے طرح طرح کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ فراز سے کم نشیب سے زیادہ، بہت زیادہ۔ قمار بازی کی پاداش میں قیدخانے جانے کا حادثہ بڑا سخت تھا۔ اس وقت کی دہلی کی اشراف سوسائٹی میں اس طرح کی لغزش ناقابل معافی تھی۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے اس موقع پر غالب کی جس طرح دستگیری اور غم خواری کی وہ طبقۂ اشراف (ارسٹوکریسی) کی روایتی جرأت، فیاضی اور وضعداری کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ غالب نے جس خلوص اور شاعرانہ خوبصورتی سے اس ایک شعر میں شیفتہ سرائی کی

ہے اس نے اسے ضرب المثل بنا دیا ہے۔ ایسی ضرب المثل جس کو صرف اہلِ ذوق برمحل معرض گفتار میں لا سکتے ہیں:

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

یوں بھی غالب کو شیفتہ سے جو ارادت تھی وہ کم اور لوگوں سے تھی۔ خاندانی مناقشے، اقربا کی بے اعتنائی، عزیزوں کی وفات آمدنی حد سے زیادہ محدود کبھی مسدود، قرض کی گرانباری، غرض وہ تمام بلائیں جو خانۂ انوری کی تلاش میں آسمان سے مصرعوں میں نکلی تھیں، خانۂ غالب پر مشاعرہ بن کر نازل ہوتی رہیں اور غالب کا یہ کہنا غلط نہیں معلوم ہوتا کہ اگر ستمہائے عزیزاں کی شرح کروں تو جہاں سے رسم امید اٹھ جائے زندگی گزرتی رہی، راہ گذر یاد آتا رہا۔ اس ڈرامے میں جا بجا غالب کا پارٹ بھی قابلِ تحسین نہیں تھا۔ لیکن آلام کی اس یورش میں غالب نے جتنے اچھے شعر کہے اور بے مثل خطوط لکھے، ان کے مقابلے میں اگر ان کے اعمال کے کچھ مصرع تقطیع سے گرتے ہوں تو اس سے ان کو کافر نہیں صرف گناہ گار سمجھنا چاہیئے۔ رفتہ رفتہ قلعے سے توسل ہوا، مشاعروں میں شرکت ہونے لگی۔ صریرِ خامہ صدائے سروش یا صدائے سروش صریرِ خامہ میں ڈھلتی رہی۔

اسی زمانے میں غالب نے اردو خطوط لکھنے شروع کئے جن کی اہمیت غالب کے شعری نتائجِ فکر سے کم نہیں۔ دل کے معاملے میں غالب کو ان کے اشعار کے انتخاب نے رسوا کیا ہو یا نہیں، ان کے رقعات نے یقیناً ان کو محبوبِ خلائق بنا دیا۔ ان کی شاعری میں فکر و تخیل بیدار ہے تو ان کے خطوط میں زندگی اور شخصیت کا حسن اور حرکت ہے۔ فارسی اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے شعر و ادب میں بھی یہ صنف عام رہی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ دوسری زبانوں میں غالباً خطوط کو وہ اہمیت نہیں دی گئی نہ وہ اتنے متنوع ہیں جتنے کہ غالب کے خطوط مجھے خطوط نگاری کی تاریخ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ بچپن میں انشائے مادھو رام، جوانی میں لیڈی چیٹرلی کے عاشق کے خطوط اور بڑھاپے میں مولانا ابو الکلام آزاد کے مکاتیب نظر سے گزرے۔ ممکن ہے اسی کا ردِ عمل ہو جس کی وجہ سے اس پر اصرار ہے کہ میرے خطوط خواہ کسی کے نام ہوں، شائع نہ کئے جائیں۔

ہندوستان میں فارسی خطوط بالعموم اتنے خطوط نہیں ہوتے تھے جتنا ان میں تصنع و تکلف کی نمائش اور الفاظ و عبارت کا اسراف ملتا تھا۔ فارسی نثر میں بالخصوص ترصیع و تکلف کے جتنے پناہ گزیں (رفیوجی) ملتے ہیں، شاید ہی کسی اور زبان میں نظر آئیں۔ فارسی کا یہ تصرف اردو پر رہا۔ عبارت کے تکلفات ہی کا نہیں اسالیب کے تنوع کا بھی۔ یہ اسی کا فیضان ہے کہ ہندوستان میں اردو جیسی کثیر الاسالیب اور کثیر الاصناف زبان شاید کوئی دوسری نہ ہو۔ اس میں رقعاتِ غالب کو اردو نثر کے بنیادی اسالیب میں سے ایک نمونہ قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ خطوط کو نہ پکا گانا ہونا چاہیئے نہ فلمی، نہ قوالی۔ خط لکھنا دراصل اتنا خطبۂ صدارت تصنیف کرنے کا فن نہیں ہے جتنا گفتگو کرنے کا سلیقہ ہے اور گفتگو کرنا گفتگو ہی کرنے کا نہیں، خاموش رہنے کا بھی فن ہے۔ اس اعتبار سے بڑا سخت گیر فن ہے۔ خاموش رہنا صفاتِ الٰہیہ میں سے ہے۔ اپنے بے پایاں اور بے کراں اختیارات میں تنہا بیٹھنا خدا ہی کے بس کی بات ہے۔

خطوط نویسی کو میں فنونِ لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں۔ لیکن اردو میں اس کی مثال صرف غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ حسن و ہنر کا جو اظہار و ابلاغ

مختلف فنون لطیفہ سے علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے، گفتگو کرنے میں ان سب سے بطریق احسن کام لینا پڑتا ہے۔ اچھی گفتگو کرنے والے کی گفتگو میں نقش، رنگ، رقص، آہنگ اور شخصیت کی بیک وقت جلوہ گری ملتی ہے۔ شخص کی عدم موجودگی میں یہی کرشمہ اس کے خطوط میں نظر آئے گا۔ غالب نے جو کہا ہے کہ میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے، اسی رمز کی وضاحت ہے۔ ان امور کے پیش نظر غالب کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ تصنیف اور مصنف میں کتنی ہم آہنگی ہے۔

غالب کی شخصیت کا اظہار ان کے بہ قلم خود نوشتہ اعمال یعنی خطوط میں ملتا ہے۔ اس سے مختلف اس نامۂ اعمال میں ملے گا جسے ان کے کاتب اعمال فرشتے نے مرتب کیا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ فرشتے کے لکھے ہوئے نامۂ اعمال پر غالب کو آخرت میں سزا کا حکم سنا دیا گیا ہو گا لیکن خطوط کے مطالعے کے بعد اور اس کے صلے میں غالب کو عرش معلیٰ کے جوار میں کوئی محل ضرور الاٹ کیا گیا ہو گا۔ اس طرح ان کی دیرینہ حسرت تعمیر پوری کر دی گئی ہو تو عجب نہیں۔ جنت میں قصر نہ دیئے جانے کے بارے میں یوں شبہ ہے کہ بہشت، رضوان اور حور و غلماں کے بارے میں غالب نے اس دنیا میں وقتاً فوقتاً جیسے خیالات ظاہر کئے تھے، ان کے بہ نفس نفیس وہاں پہنچ جانے سے جنت کی ڈسپلن میں خلل پڑنے کا قوی امکان تھا۔ اس طور پر جنت نیک روحوں کی آرام گاہ نہیں نوجوان طلبہ کی تعلیم گاہ یا آماجگاہ بن جاتی۔ غالب سنس آف ہیومر ذہانت اور خوش طبعی کا ملا جلا ملکہ) سے جتنے بھرپور تھے، فرشتے اس سے اتنے ہی معصوم ہوتے ہیں اور سنس آف ہیومر کی پوری داد صرف خدا یا اس کے بعض منتخب بندوں ہی سے مل سکتی ہے۔

خطوط نگاری کے رمز سے غالب بہت پہلے سے واقف تھے۔ اس کے آئین و اصول ایک مختصر فارسی رسالے میں مدون کر چکے تھے۔ البتہ یہ امر تعجب اور دلچسپی سے خالی نہیں کہ اردو خطوط کے لکھنے میں غالب زبان کی جو سادگی و سلاست ملحوظ رکھتے تھے، وہ ان کے فارسی خطوط میں کیوں نہیں ہے۔ غالب نے اردو میں جو تقریظیں لکھی ہیں وہ فارسی عربی الفاظ، عبارت اور ترکیبوں سے اس درجہ بوجھل ہو گئی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے، انھوں نے یہ فرسودہ روشِ عام کیوں اختیار کی، جب وہ اپنے خطوط میں ایسی بے مثل اردو لکھ سکتے تھے۔ یہ بھی عجم کا فیض ہے کہ وہ فارسی کے تکلفات سے اپنے کو علیحدہ نہ کر سکے۔ شاید یہ بھی ایک سبب ہو کہ ظہوری کے سب سے بڑے عقیدت مندوں میں ہیں۔ جس کا اعتراف انھوں نے فارسی غزلوں میں بڑی کثرت سے کیا ہے۔ ظہوری کے ہاں فارسی نثر کے جتنے تکلفات ملتے ہیں، وہ ان کے زمانے میں یقیناً مقبول تھے لیکن غالب اور ان کی جینیس اس سے مختلف تھی۔ اس کا ردعمل وہ کیوں نہ ہوا جس کی سب سے زیادہ توقع غالب سے تھی۔

غالب کی کوئی اولاد نہ تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ گھریلو زندگی بھی خوش گوار نہ تھی۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

با من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر
آں کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

کیا تعجب جہاں تک صاحب نظر ہونے کا تعلق ہے، پدر اور پسر ہی کے نہیں شوہر اور بیوی کے روابط بھی خوشگوار نہ رہتے ہوں۔ اصل نسبی کام نہ آئی۔ اکابر و اقربا ویسے ہی ثابت ہوئے جیسا کہ آلام و ادبار میں اکثر ہو جایا کرتے ہیں۔ کتنی اور کلفتوں کا سامنا رہا جس کے ذمہ دار کبھی یہ

خود ہوئے کبھی دوسرے۔ ان سب کا مداوا اور تلافی غالب نے دوستوں اور شاگردوں سے محبت بڑھانے اور ان کی عقیدت و اعتبار حاصل کرنے میں ڈھونڈھی اور پائی۔ اس طرح ان کی سیرت اور شخصیت میں جو مروت و محبت آئی وہ ان تمام امتیازات سے زیادہ گرانمایہ تھی جو سو پشت سے آبا کے پیشہ سپہ گری میں بھی ان کے اسلاف کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

انھوں نے اپنے کلام کی طرح اپنی پہلو دار شخصیت سے ہر طبقے اور ہر مسلک کے عزیزوں اور دوستوں سے اپنے کیسے کیسے ویرانے آباد کرلئے تھے۔ غالب کا ہر خط ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ زندگی کی معمولی سے معمولی باتوں کو اکثر اس انداز سے پیش کیا ہے جیسے زندگی کے بڑے بڑے حقائق انھی معمولی باتوں کی کھلی چھپی یا بدلی ہوئی شکلیں ہوں۔ جن کو ہنسی خوشی انگیز کرنے اور کرتے رہنے میں انسان کی بڑی جیت ہے۔ خدا کی مشیت میں مضمر ہونے کے اعتبار سے ہر بات خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، وزن اور وقعت رکھتی ہے۔ اس لئے اس کے سب سے بڑے شاہکار انسان کو توفیق دی گئی ہے کہ معمولی سے معمولی باتوں سے اچھی سے اچھی باتیں سیکھے اور سکھائے۔ اس طرح انسان کی مسرت و آگہی میں اضافہ کرے۔ خدا نے انسان کو انبوہ میں نہیں بلکہ فرداً فرداً پیدا کیا اور یہاں دنیا میں بھیجا ہے تاکہ وہ پیغمبروں کی طرح اپنے فرائض کو خواہ وہ کتنے ہی معمولی درجے کے کیوں نہ ہوں خدا کی تاکید و تائید پر نظر رکھ کر بجا لائے۔ بعثت پیغمبروں کی ہی نہیں ہوتی ہر فرد کی ہوتی ہے۔ صرف فریضے اور میدان جدا ہوتے ہیں۔

غالب اپنی عالی نسبی کے اعتبار سے اس وقت کی دہلی سوسائٹی میں جس مقام کا اپنے کو مستحق سمجھتے تھے، اس کے حصول میں ان کو ناکامی ضرور ہوئی لیکن اس کا اثر ان کی سیرت و شخصیت پر اچھا پڑا۔ وہ اشراف کے طبقے کے ہوتے ہوئے عوام کی تقدیر کی جبرت اور عظمت کے نمائندہ ہو گئے۔ اگر وہ ثروت و اقتدار کے اعتبار سے دہلی کے اکابر و اشراف کے درجے پر پہنچ گئے ہوتے تو شاید ان کا تعلق عامۃ الناس سے اتنا عزیزانہ اور مخلصانہ نہ ہوتا جتنا کہ ہوا۔ چنانچہ ان کے رقعات میں جو ان کو عام لوگوں سے قریب تر کرنے میں سب سے زیادہ معین ہوئے، نسب کے تفاخر کی اتنی نہیں جتنی عامۃ الناس سے ہمدمی کی فضا ملتی ہے۔ وہ اپنے اشعار سے زیادہ اپنے خطوط میں ہم سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ اشعار میں وہ کبھی کبھی ہم سے دور بہت دور نظر آتے ہیں۔ خطوط میں نزدیک سے نزدیک تر کبھی کبھی ہم ان خطوط سے جتنا متاثر ہوتے ہیں، اتنا ان کے اشعار سے نہیں۔ ایسے خطوط جو اشعار یا انشائیہ کے انداز میں لکھے جاتے ہیں وہ کتنے ناقابل برداشت ہوتے ہیں، اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اشعار میں بالعموم حسن و عشق کے واردات، انفس و آفاق کے رموز، فطرت کی نقاشی، زندگی و زمانہ کے نشیب و فراز اور کبھی کبھی صرف الفاظ عبارت کی نمائش ملتی ہے اچھے خطوں میں شخص و شخصیت کا انکشاف، ایک دوسرے کی عزت و محبت کا اعتراف و اظہار اور اس میں شرکت کی دعوت ملےگی۔ دل کا معاملہ اشعار میں اتنا نہیں کھلتا جتنا خطوط میں۔ اس اعتبار سے غالب کے خطوط ان کے اشعار سے زیادہ گھر کے بھیدی ہیں۔

غالب کے اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے میں کلام نہیں وہ اور ان کے اسلاف اعلیٰ تہذیبی روایات و اقدار کے حامل تھے ان کا احساس رکھتے تھے اور اس کی ذمہ داری کو پہچانتے تھے۔ فطرت کی طرف سے ان کو غیر معمولی ذہن و ذوق ملا تھا اپنے ذہن اور اپنے نسب دونوں کے اعتبار سے وہ معاصرین میں اپنی منزلت قائم رکھنے کے بے حد خواہش مند تھے یہ خواہش بیجا نہ تھی لیکن جیسا کہ اس طرح کے مقاصد و مساعی کا اکثر انجام ہوا کرتا

ہے، وہ توقع کے مطابق پورے نہ ہوئے۔ اس مہم میں جتنی ناکامی ہوئی اتنی ہی وہ اپنی کوششوں کی سمت بدلتے اور رفتار بڑھاتے گئے۔ دوسروں کی بھلائی اور برتری کے کاموں میں اس طرح کی سرگرمی مفید و موثر ہوتی ہے اور بالآخر کامیاب ہوتی ہے لیکن اپنی بھلائی اور برتری پیش نظر ہو تو یہ طریق عمل بے سود ہی نہیں نقصان دہ بھی ہوتا ہے۔ غالب کو یہی پیش آیا۔ تفصیل میں جائے بغیر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ذہنی تخلیقات کے اعتبار سے غالب کی جتنی شاندار شبیہ سامنے آتی ہے۔ ان کے شخصی کردار کے بعض پہلوؤں کے تصور سے نہیں آتی۔

ہم جس معیار سے کسی کی سیرت یا شخصیت کو پرکھنا چاہتے ہیں وہ یا تو فرشتے کو سامنے رکھ کر وضع کرتے ہیں یا شیطان کو۔ حالانکہ تو ان پرکھنا مقصود ہوتا ہے انسان کو جو دونوں کا مرکب، اس لئے دونوں کے لئے وجہ جواز بھی ہوتا ہے اگر غالب کے قبلہ یا قبلہ نما عجم کے یزدان و اہرمن کو ذہن میں رکھیں تو اس دشواری و نزاکت کا اندازہ کر سکتے ہیں، جو دونوں کو انسان کی تخلیق میں پیش آئی ہوگی۔ یعنی انسان کی ترکیب میں یزداں اور اہرمن اپنی اپنی نیابت یا تصرف کا تناسب کیا رکھیں، غالباً اس کا تصفیہ نصف نصف کے اصول پر ہوا ہوگا جو یزدان اور اہرمن کا اتنا نتیجۂ فکر نہیں معلوم ہوتا جتنا انسان کی خوش طبعی یا ستم ظریفی کا۔

غالب کی شخصیت اسی محور پر گردش کرتی ہے۔ وہ اپنے "آدم زادہ" ہونے پر فخر "دم زعصیاں می زنم" کا اعلان اور "مے نوش و تکیہ بر کرم کردگار کن" کی تلقین کرتے ہیں، زندگی کو اس طور پر آزمانے اور اس سے آسودہ و عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ ایک سلجوقی ترک ہی کر سکتا تھا جو مغلیہ تہذیب کا بڑا دلکش نمونہ بھی تھا۔ غالب کو غالب ہی کے رنگ میں دیکھنے اور پسند کرنے والے ایسے خیالات سے شاید ہی اتفاق کریں جہاں غالب کو ان کے اعمالِ عالیہ سے متصف کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو خانقاہوں میں بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں چہ جائیکہ خرابات میں جس سے غالب ہمیشہ نزدیک تر رہے۔ غالب طبقۂ زہاد سے نہ تھے، رندانِ قدح خوار میں تھے۔

وہ شاعر ہونے کے اعتبار سے بے مثل، شخص کی حیثیت سے صلح پسند، عافیت جو، بامروت، خیر منش، وضعدار، غیر معمولی حد تک ذہین و طبّاع، و نفاست پسند تھے۔ خردوں، دوستوں اور شاگردوں پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کو سب کچھ دیدینا اور سکھا دینا چاہتے تھے۔ دو ایک کے سوا ہندوستان کے فارسی شعرا اور اہل قلم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اردو شعر و ادب میں بھی کسی کو اپنے قبیل یا قبیلے کا نہیں مانتے تھے۔ بعض دوستوں اور قدر دانوں کا اخلاقاً نام لیتے ہیں مگر اس طور پر کہ اپنے اعترافِ نیازمندی کی آڑ میں اپنی فوقیت انھی پر نہیں نکتہ سرایانِ عجم پر بھی جتاتے ہیں۔ یہ چند شعر ملاحظہ ہوں:

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم
چہ بہ منت بسپاریمی از کم شاں!!

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدمِ شاں

ہمدمی کی خوشبو اور تنہائی کا کیسا حزیں احساس و آہنگ ان اشعار میں ملتا ہے۔

مرزا سوجھ بوجھ کے آدمی تھے، اپنے نفع و ضرر کو خوب سمجھتے تھے۔ اس کے مطابق عمل کرتے۔ کبھی کبھی وہ بھی کر ڈالتے جو نہ کرتے تو اچھا کرتے۔ حکام اور رؤسا کی خوشنودی حاصل کرنے اور ان سے نفع اٹھانے کے لئے تمام عمر کوشاں رہے۔ لیکن اس کے مطابق کامیابی نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کو جن ناسازگاریوں کا سامنا ہوا، اسے دیکھتے ہوئے ان کے شعری و ادبی کارناموں کا اندازہ کریں تو معلوم ہوگا کہ خدا نے ان کو ناکامیوں سے کام لینے کا کیسا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا۔

آدمی کو جو نعمت فطرت سے نصیب ہوتی ہے، چاہتا ہے کہ اس کے مطابق سوسائٹی سے بھی ملے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ فطرت کی بخشش کسی اصول کے ماتحت نہیں ہوتی۔ جسے جو مل گیا، مل گیا۔ دوسری طرف سوسائٹی کے ضوابط انسانی اور اجتماعی ہوتے ہیں۔ جب تک کوئی شخص اس کے مقررہ آئین و عبادت کو پورا نہیں کرتا، سوسائٹی اس کو لائقِ التفات نہیں سمجھتی۔ لیکن کیا کیجیے کہ جینیس سوسائٹی کا کم ہی احترام کرتی ہے۔ اور یہ سوسائٹی کی معذوری یا عالی ظرفی ہے کہ وہ جینیس کا احترام کرتی ہے۔ غالب نے ولی ہونے میں اپنی بادہ خواری کو حائل بتایا ہے ممکن ہے کوئی اور بادہ خواری سے تائب ہو کر ولی ہو سکتا۔ سوال یہ ہے کہ بادہ خواری سے تائب ہو کر غالب، غالب بھی رہ جاتے یا نہیں۔

ادب اور ادیب کے باہمی روابط کیا ہیں، تنقید ادب میں پرانی بحث چلی آتی ہے۔ تنقید کا وہ دبستان جسے خارجی (EXTRINSIC) کہا جا سکتا ہے، نفسیات، فلسفہ اور معاشرہ کے دریچوں کی طرح حریمِ فن میں ادیب کے سوانح اور سیرت کے دریچوں سے بھی داخل ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کو گوئٹے کا یہ قول نہ بھولنا چاہیے کہ گوئٹے، ہزاروں سور، بکری اور گائے بیل اور ہزاروں من اناج سے مرکب نہیں ہے جو اس نے اپنے دورانِ حیات میں ہضم کئے ہیں۔ انسانی ذہن (خاص طور پر فنکارانہ ذہن) ایک نہایت پر پیچ و خم وادی ہے جس میں سے محرکاتِ خارجی گزرتے ہیں تو وہ نہ صرف اپنی کمیت بلکہ اپنی کیفیت کے اعتبار سے بھی بدل جاتے ہیں۔ کوئی بھی ادیب اپنے فن میں اپنی سیرت یا سوانح کو بے کم و کاست نہیں پیش کرتا۔ ڈرامائی ادب میں تو اسے اپنی شخصیت کو دوسروں کی "خودیوں" میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ البتہ لرک اور غزل میں (جو غالب کا فن ہے) کافی حد تک اس بات کی گنجائش ملتی ہے کہ فنکار اپنی "حسرتوں کا شمار" کر سکے۔ یہاں بھی ضروری نہیں کہ وہ جن اقدارِ عالیہ پر زور دے رہا ہے، اس پر عامل بھی رہا ہو۔ اگر فن کی یہ تعبیر صحیح ہے کہ اس میں حقائق کو عینیت کی عینک سے دیکھا جاتا ہے تو فنکار کے اکثر اقدار خیالی ہوتے ہیں۔ یا وہ ہوتے ہیں جن کو وہ حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کر سکا۔ غالب اپنے مسلک پر مستحکم رہتے یعنی

بخش دو گر خطا کرے کوئی

تو نواب شمس الدین خاں بہادر کے پھانسی دیے جانے پر خوشی کا اظہار نہ کرتے۔ لیکن نفسیاتِ انسانی کے اس نکتے کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ انسان کی بنیادی فطرت کا کبھی کبھی اس کے اخلاقی اقدار پر غلبہ پا جانا تکلیف کی بات ضرور ہے، تعجب کی نہیں۔

ادبی تنقید کے نقطۂ نظر سے کسی ادیب اور شاعر کے سوانح حیات کا صرف وہ حصہ لائقِ اعتنا ہے جس کے بارے میں خارجی

شواہد موجود ہوں یعنی اصل واقعاتی محرکات کیا تھے۔ ان واقعاتی محرکات کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہ جاتی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فنی تخلیق عام طور پر موڈ یا وقتی ذہنی کیفیت کی تخلیق ہوتی ہے۔ غالب نے جس ڈومنی کو مار رکھا تھا اور غالباً جس کی وفات پر "ہائے ہائے" والی دردناک غزل لکھی ہے، ضروری نہیں کہ غالب کو اس سے والہانہ شیفتگی رہی ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ لمحاتی اعتبار سے غالب نے اس کی جدائی کی تڑپ کو محسوس کیا ہوگا۔ یوں بھی غالب کی پوری زندگی اور ان کے کلام کو سامنے رکھیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ حسن، عقل، عشق اخلاق اور زندگی اور موت کے اسرار و معارف سے جتنے آشنا تھے اور جس قدرت اور خوبصورتی سے کبھی ان پر سے نقاب اٹھاتے تھے یا ان پر نقاب ڈالتے تھے، اتنے وہ عورت یا جنس کی طرف مائل نہ تھے۔ ان کے بعد کے غزل گو شعرا اس بارۂ خاص میں غالب کی پیروی نہ کر سکے، شاید کر بھی نہیں سکتے تھے۔ حالانکہ جیسے اعلیٰ درجے کے غزل گو شعرا جس کثرت سے گزشتہ ساٹھ ستر سال میں ہمارے سامنے آئے وہ شاید ہی مستقبل قریب میں نظر آئیں۔

فن پارے سے فنکار کی سیرت و شخصیت کے نقوش کو جمع کرنا تنقید ادب کا دلچسپ لیکن خطرناک یا گمراہ کن مشغلہ رہا ہے۔ یہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ فن شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ جہاں تک LYRIC اور کسی حد تک غزل کا تعلق ہے، اس میں شک نہیں کہ فنکار کے وارداتِ قلبی، اس کی بصیرتوں، مسرتوں اور محرومیوں کی اکثر غماز ہوتی ہے۔ لیکن اس کا اطلاق بیانیہ یا ڈرامائی شاعری پر نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ ان اقسام کی شاعری میں شاعر کو بیشتر دوسروں کا قالب اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جمالیات کے نئے نظریے سے ثابت ہے کہ فن شخصیت کا اظہار ہوتا ہے لیکن ان میں شخصیت پر قطع و ایزاد کا عمل بھی لازم آتا ہے۔ میں نے جو کہیں یہ بات کہی ہے کہ ایک نامعقول شخص معقول شاعر نہیں بن سکتا، اس کا مفہوم یہ ہے کہ فن کار کم سے کم اپنے تخلیقی لمحات میں کریم النفس اور معقول ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کی زندگی کے بیشتر لمحات کا تعلق لین دین کی اس دنیا سے ہوتا ہے جو اس کے اردگرد پھیلی ہوتی ہے اس لئے وہ عملی اور اخلاقی لحاظ سے اکثر و بیشتر نامعقول نظر آئے تو عجب نہیں۔ فن و شعر کی دنیا میں نامعقولیت کا گذر نہیں۔ یہاں نامعقول بات بھی حسن ادا سے کہی جاتی ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے:

در عرضِ شوق حسنِ ادا بودن است شرط!

غالب کے شعری کارناموں کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے اور غزل کے بارے میں خیال ہے کہ یہ شخصیت کے اظہار کا وسیلہ کہی جا سکتی ہے اس لئے اگر کوئی تنقید نگار غزل کے چور دروازے سے غالب کی شخصیت و سیرت کے نقوش جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اصول نقد کی رو سے درست اور بجا ہے۔ غالب کے تنقید نگار کو اس سلسلے میں یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ وہ شخصیت و سیرت کے ان نقوش کو ان کے خطوں کے حوالے سے متحقق کر سکتا ہے۔ غالب کے خطوط اور ان کی غزلوں سے پتہ چلتا ہے کہ غالب ایک مخصوص انفرادیت کے حامل تھے۔ ان کو "پابستگی رسم و رہِ عام" اور طرزِ جمہوری سے چڑ تھی۔ خطوط اور غزلیں دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کو زمانے کے ہاتھوں اپنی ناقدری کا احساس تھا۔ اپنی نسبت سے "عندلیبِ گلشن ناآفریدہ" کی ترکیب کا استعمال انھوں نے بیس سال کی عمر سے پہلے ہی کیا تھا "شہرتِ شعرم بگیتی" تو ادھیڑ عمر کی بات ہے۔

رندمشربی کے وہ عناصر جو ان کے خطوط میں کافی ملتے ہیں، غزلوں میں بھی کمیاب نہیں۔ اپنے لئے "رندِ شاہد باز" "ولی پوشیدہ اور کافر کھلا" اس بات کی طرف واضح اشارے ہیں:

ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

ع ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

ع کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یارب

وغیرہ، ان کے رندانہ نقطۂ نظر کی واضح ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کی شہادت اشعار ہی سے نہیں مکاتیب سے بھی ملتی ہے جہاں ہندو، مسلمان اور عیسائی کی تفریق کے خلاف بیک وقت قرآن، انجیل اور چار بیدوں کی قسم کھاتے ہیں۔ غالب کی شخصیت کے چند اور پہلو جو ان کی غزلوں سے نمایاں ہیں اور جن کی تصدیق خطوط سے بھی ہوتی ہے، ان کی انسانیت دوستی اور کریم النفسی ہے، مثلاً:

ع بخش دو گر خطا کرے کوئی

ع کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند

ع واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ایسے بے شمار مصرعے ہیں جن میں غالب کے مسلکِ انسانیت کے نقوش مل جائیں گے۔ غالب لذتِ گناہ سے آشنا تھے لیکن انکو اپنی معصیت کا احساس نوجوانی سے رہا ہے۔ ابتدائی دور کے ایک قصیدۂ منقبت میں کہتے ہیں:

جنس بازارِ معاصی اسداللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شراب اُن کی گھٹی میں پڑی تھی جس کا آج غالب کی فلم اور تنقید دونوں میں بہت چرچا ہے۔

غالب کی سیرت و شخصیت پر اب تک جو فلمیں تیار کی گئی ہیں، ان سے بھی "غالب ناشناسی" کا ثبوت ملتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی اور سب سے معمولی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ غالب اپنی اعلیٰ نسبی اور غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر اس وقت کی دلی کے اعیان و اکابر میں شمار ہوتے تھے۔ شرفائے دہلی کا شیوہ یہ نہ تھا کہ وہ کسی ڈومنی کے ساتھ شراب میں بدمست منظر عام پر نظر آئیں۔ اس ڈومنی کا غالب کی شخصیت، شاعری اور شیوۂ زندگی سے کوئی ربط نہ تھا۔ شراب میں سرشار ہو کر عورت سے بے تکلف ہونا غالب کا مزاج نہ تھا۔ ان کا عیاش یا اوباش PROFLIGATE ہونا کہیں سے ثابت نہیں۔ ان کی شاعری میں بھی عورت سے لمس و لذت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

عوام اور عوامی ہونے سے غالب جتنا دور تھے اور تمام عمر رہے، اسے غالب کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ عوام کی خاطر غالب کو مسخ کرنا کسی قیمت پر گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ ان فلموں کا پلاٹ اور پرداخت ڈومنی اور شراب کے پس منظر میں نہیں بلکہ غالب کے کلام کے اعجاز و احترام

کو ملحوظ رکھ کر کسی معتبر غالب شناس کی نگرانی میں ہونی چاہیے تھی۔ غالب اتنے شراب خوار نہ تھے جتنے شراب کے ادا شناس، ایسے ادا شناس جس کی مثال اردو کے سوا شاید ہی کسی اور شعر و ادب میں ملے۔ شراب نے غالب کو جتنا رسوا کیا، غالب نے اسے اتنی ہی آبرو بخشی شراب کو غالب نہ میسر آتے تو اردو شاعری بعض کتنے زرخیز و زرّیں تصورات سے محروم رہ جاتی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، غالب کی مے نوشی ان کے کلام کے بے مثل رنگ و آہنگ میں دیکھنا چاہیے، مثلاً ان کے ان اشعار کی روشنی میں:

ع جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا

ع گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے

ع پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار وغیرہ

اسی طرح غالب کے خطوط سے ان کی شخصیت کے "نقش ہائے رنگ رنگ" لئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کی فلموں پر حکم لگانے کا تعلق میرے اگلے وقت آپ کے فی الوقت اور کسی اور کے ابن الوقت ہونے سے اتنا نہیں ہے جتنا صحیح اور صحت مند ذوق اور ظرف سے ہے۔ ذوق و ظرف ہمیشہ خواص کا "مجوّزہ مکتب" (عدالتی اختیارِ سماعت) رہا ہے اور رہے گا۔ سیاست کو دین سے جدا کر دینے سے بڑی چنگیزی، معاشرے کو حیا اور حمیت سے بیگانہ کرنا اور رکھنا ہے۔

شراب اور عورت کے بارے میں چاہے جتنے امتناعی احکام جاری اور نافذ کیے گئے ہوں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مصلحتِ الٰہی کو بہشت میں بھی ان کی رعایت رکھنی پڑی خواہ ان دونوں کو کتنا ہی بے ضرر بنا کر رکھا گیا ہو۔ بہشت میں شاعر کی گنجائش رکھی گئی، یہ تو نہیں معلوم، لیکن جہاں شراب اور عورت ہوگی وہاں شاعر کا ظہور ہو کر رہے گا۔ فرق صرف ذوق اور ظرف کا ہوگا یعنی شراب اور عورت ہوگی ویسا ہی شاعر ہوگا۔ گفتگو ضمنی ہونے کے باوجود طویل ہو گئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ موضوعات ایسے ہوں اور محفل ایسی ہو تو اس طرح کی لغزش ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غالب شراب پینے کو معصیت خیال کرتے تھے لیکن وہ اس معصیت کو مرتفع اور مکرم کرنا بھی جانتے تھے اور یہی غالب کا اسٹائل تھا۔

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

انھوں نے اپنے احساسِ معصیت کا اسی طرح اظہار اپنے خطوط میں بھی کیا ہے اور کس خوبی سے اس کو حسنِ معصیت میں تبدیل کر دیا ہے؛ جہاں وہ کہتے ہیں:

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

اس غلامِ ساقیٔ کوثر کا طنطنہ دیکھیے جو بالآخر کس طرح جام واژگوں بن جاتا ہے۔

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

غالب نے اپنی غزلوں میں اپنی ذات کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے۔ لیکن ان کی غزلیں محض شخصیت کا اظہار نہیں ہیں۔ وہ ان کی ناتمام حسرتوں کا شمار بھی کرتی ہیں۔ وہ رند ہوتے ہوئے بھی خلعت و خطاب و جاہ کے طالب تھے۔ ان کو اپنی فنی تخلیق سے تسلی نہیں ملتی تھی جب تک اس کی جلو میں صلہ و ستائش نہ آئیں، ہر چند وہ اس سے انکار کرتے رہے۔ غالب تمام عمر طالب رہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے طالب کا لفظ اپنے خطوط میں بارہا استعمال کیا ہے۔ غالب اور طالب کا ہم قافیہ ہونا ایک غیر متوقع ستم ظریفی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ طالب کبھی بھی اپنے کو "گداگر" نہ بنا سکا، یہاں ان کی انانیت مانع آتی تھی۔ فن شعر ان کے لیے گریز کا وسیلہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا گریز اردو شاعری کی معراجِ کمال بن گیا ہے۔

فن و سیرت کے اس باہمی ربط کی روشنی میں غالب کی دو شخصیتیں سامنے آئیں گی، ایک سیرت نگار کا غالب دوسرا اشعار کا غالب۔ سیرت نگاری میرا فن نہیں لیکن اشعار میں جس غالب سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے، وہ نہایت خلیق، وسیع المشرب، صلح جو، نیک دل، وضعدار اور دانشمند غالب ہے۔ ان کے تصورات اور تخیلات نہ صرف حسین بلکہ جدید بھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک صدی گزر جانے کے بعد شہرتِ شعرِ غالب پر زوال نہیں آیا ہے۔ غالب کی انفرادیت پسندی اور انانیت کے پس پردہ بیسویں صدی کا مزاج روپوش تھا۔ غالب مجموعی طور پر وحدت الوجود کے دائرے سے نہ نکل سکے اور "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" کہتے رہے تاہم وارداتِ حسن و عشق کی فنکاری میں ان کی انفرادیت قدم قدم پر نمایاں ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک پر اسرار بے اطمینانی کے آثار نظر آتے ہیں جو کبھی ان سے یہ کہلواتی ہے:

مانبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

اور کبھی زندگی کا یہ مردانہ تصور پیش کرتے ہیں۔

مرد آنکہ در ہجوم تمنا شود ہلاک

کبھی یہ:

اپنی نسبت ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

کہا جاتا ہے کہ انانیت کا تصور شیطنت کے تصور سے جا ملتا ہے اور ہر بڑے شاعر میں بقدر ذوق یا ظرف یہ عظیم انحراف یا شیطنت ملتی ہے۔ اس عنصر کے بغیر ایک شخص اچھا شاعر تو بن سکتا ہے لیکن عظیم شاعری کی سرحدیں اکثر و بیشتر کافری کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ملیں گی۔ غالب کی عظمت میں اس کافری کا خاصا دخل ملتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لے اتنی بلند ہوتی ہے کہ غالب منصور سے بھی آگے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مثلاً:

آوازۂ انا اسد اللہ در افگنم

"انا اسد اللہ" کا یہ نعرہ اردو کے کسی شاعر نے نہیں لگایا ہے یہ غالب کی انفرادیت کی آواز ہے وہ انفرادیت جس نے غالب کو مسلک

جمہور" سے دور اور خلاف رکھا اور وہ ایک " اندازِ بیاں اور" کی تخلیق کر سکے۔

عملی زندگی میں مذہب کی جانب غالب کا اجتہادی نقطۂ نظر اتنا بھی نہ تھا جتنا مومن کا لیکن خیال کی دنیا میں پہنچ کر غالب "ملتوں کو مٹا کر" اجزائے ایمان" بنا دیتے ہیں اور" لباسِ دین" کو اس طرح ترک کر دیتے ہیں

زمن حذر نہ کنی گر لباسِ دیں دارم
نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

بت در آستیں دارم" رکھنے والا یہ کافر مذہب کو ایک سعیٔ پشیمان کا حاصل، سمجھ کر کہتا ہے۔

کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

لیکن نعت اور منقبت میں جیسے پر زور اور پر شوکت قصیدے غالب نے تصنیف کئے ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر یا مسلمان ہونے میں غالب نے انتخاب کی آزادی کو پورے طور پر برتا ہے۔ خواہ وہ عقیدہ یا عقیدت محض روایتی ہو پھر بھی غالب کے موحد ہونے اور ترک رسوم کے کیش کے پابند ہونے کا ثبوت ان کے اردو اور فارسی کلام دونوں میں بار بار ملتا ہے۔ جنت کے محدود تصور کا انھوں نے جس تفریحی اور طنزیہ لہجے میں ذکر کیا ہے، وہ ضرب المثل بن چکا ہے۔ جنت کو دوزخ میں ڈال دینے کی جیسی جرأت غالب نے دکھائی ہے وہ اردو فارسی کے دوسرے شعراء کے ہاں شاید نہ ملے۔ فارسی کلام میں بھی انھوں نے ایک جگہ کہا ہے:

خلد را از نفسِ شعلہ فشاں می سوزم
تا نمانند حریفاں کہ سرِ کوئے تو بود!

غالب کا کفر تنسیخِ دین نہیں کرتا بلکہ اس کی ہمہ گیری کو ثابت کرتا ہے۔ زاہد، شیخ اور محتسب سے چھیڑ چھاڑ بیشتر شاعروں کے یہاں روایتی انداز میں ملتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ رنگ زیادہ واضح اور گہرا ہے۔ ان کی وسیع المشربی اور ملتوں کو مٹا کر اجزائے ایمان بنانے کا حوصلہ، ان کو اپنے مذہبی ماحول کی کشاکش میں مبتلا رکھتا ہے۔ عملی انسان نہ ہونے کے باعث انھوں نے اس خیال کی دنیا میں خوب خوب حساب چکایا ہے۔ مثلاً:

جنت نکند چارۂ افسردگیٔ دل
تعمیر باندازۂ ویرانیٔ ما نیست

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

مٹتا ہے فوت فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

در دیک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

ع لاف دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم

ع غالبؔ من و خدا کہ سرانجامِ بر شگال

ع غیر از شراب وانبہ و برفاب و قند نیست

عمل اور خیال دونوں دنیاؤں میں غالب نے زندگی کو گوارا بنانے میں اس حسِ لطیف سے کام لیا ہے جس کی بنا پر حالی نے ان کو حیوانِ ظریف کے نام سے یاد کیا ہے۔

یہ حس مفقود ہوتی تو زندگی اور زمانے کا آشوب انہیں معلوم نہیں کس اور کتنی درماندگی تک پہنچا دیتا۔ ان کی شاعری میں حرماں نصیبی کا احساس ملتا ہے لیکن کلام کی فضا مرض و مایوسی کی اتنی نہیں ہے جتنی تحمل اور تامل کی۔ غالب کا الم کسی عشقیہ واردات یا المیہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اپنی حسرتوں کے شمار کا مرہونِ منت ہے۔ یہ حزن اتنا شخص کا نہیں ہے جتنا شاعر کا، جو ہر بڑے شاعر اور شاعری میں موجود ہوتا ہے۔ حزن سے تطہیرِ ذات ہوتی ہے جو ترفع کی پہلی منزل ہے۔ غالب کا بچپن ان کی جوانی سے بہتر گزرا اور جوانی بڑھاپے سے بہتر۔ ان کے گرد رؤسائے دہلی کا طبقہ تھا، شاہد و شراب کی عیش کوشیاں تھیں۔ ذہن کے پس منظر میں اکبر، شاہجہاں اور ابراہیم شاہ کی بے دریغ بخشی، سخن نوازی، "خفی راظہوری ساختہ" کی داستانیں تھیں۔ دوسری طرف اپنے کمالات کا احساس اور عرضِ ہنر کا ارمان تھا۔ کہتے ہیں:

آج مجھ سا نہیں زمانے میں

شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

یہ تمام باتیں غالب کے کلام کو حزنیہ لہجہ دینے میں معاون ہوئیں، ان کی تمام زندگی "شیشہ و سنگ" کی داستان بنکر رہ گئی تھی۔ حالی کی شہادتوں کے علاوہ غالب کے کلام میں اس بات کا ثبوت جا بجا ملتا ہے کہ غالب اپنے زبردست احساسِ ظرافت کے طفیل زندگی کے جام سے تلچھٹ کے آخری قطرے بہ خوشی پیتے" اور زندگی کی ناہمواریوں کو یہ کہہ کر ہموار کرتے رہے:

کیوں چھوڑتے ہو دُردِ تہِ جام مے کشو

ذرہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا (قائم)

اور کبھی یہ کہہ کر واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

ظرافت و مزاح کا اظہار ان کے کلام سے زیادہ ان کے خطوط میں ملتا ہے یہ ثبوت ہے غالب کے غیر معمولی احساسِ تناسب کا۔ وہ اس رمز سے واقف تھے کہ ظرافت کی جتنی سمائی خطوط میں ہے غزل میں نہیں۔ ظرافت سے خطوط کی وقعت بڑھتی ہے، غزل کی گھٹتی ہے۔ اس زندہ دلی کے سہارے غالب کو زندگی پر اعتبار رہا، اپنی محبت پر اعتبار رہا، اپنے آپ پر اعتبار رہا۔ اور جب اعتبار نہ رہا تب بھی یہ اعتبار رہا۔ جب ہی تو خوبرویوں کو چاہنے میں اپنی صورت کی پروا نہ کی۔ نہ اسے خورویوں کے چاہنے میں مانع پایا۔

کسی شخص کو پرکھنے کا ایک قابلِ اعتماد ذریعہ یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس کے گرد کیسے لوگ جمع ہو گئے ہیں یعنی اس کے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز کون ہیں۔ غالب کی شخصیت کا جائزہ اس نقطۂ نظر سے بھی لینا ضروری ہے کہ وہ مردم دیدہ مصطفےٰ خاں شیفتہ تھے، مقرب

خاص آزردہؔ وصہبائیؔ تھے۔ اور سب سے بڑھ کر اردو ادب کے سب سے بڑے فرشتہ صفت انسان حالیؔ کے ممدوح تھے۔ غالبؔ اور حالیؔ کے باہمی روابط پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کا احساس ہوتا ہے کہ غالبؔ کی شخصیت کا نقش حالیؔ کے دل پر غالبؔ کی وفات کے ۲۰۔ ۲۵ برس بعد بھی جوں کا توں رہا۔ یہاں تک کہ وہ یادگارِ غالبؔ لکھنے سے باز نہ رہ سکے۔ اس پیغمبر شرافت کے وسیلے سے غالبؔ کی عظمت پر ایمان لانا کون شخص اپنے لئے باعث افتخار و سعادت نہ سمجھے گا۔ حالیؔ اور غالبؔ طبعاً ایک دوسرے کی ضد تھے لیکن حالیؔ نے استاد کی تمام کمزوریوں اور فرو گذاشتوں کو محض اس کی انسانیت اور فنی صلاحیت کے پیش نظر بھلا دیا۔ اس سے اگر ایک طرف حالیؔ کی نیکی اور بڑائی کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف غالبؔ کی عظمت کو بھی بے اختیار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اوباشوں میں اگر غالبؔ اوباش رہے تو بڑوں میں بڑوں کی طرح جیے، کہیں بھی حق صحبت اہل کنشت" کو نہ بھولے۔ انھوں نے ہمیشہ اہل فن کو اپنی طرف متوجہ رکھا۔ زمانہ منکر غالبؔ کبھی نہیں رہا اور دہلی کے خواص نے غالبؔ کی بڑائی کو ہمیشہ تسلیم کیا۔

حالیؔ نے غالبؔ کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ مرثیہ، حالیؔ، غالبؔ اور دہلی پر آخری لفظ ہے۔ شرافت اور انسانیت اور صبر و سکوت کے حالیؔ کو میں نے اس طرح بے اختیار و بے قرار ہوتے کبھی نہیں پایا۔ جب کبھی اس مرثیے کو پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے غالبؔ کی وفات نے حالیؔ کی تمام خفیہ و خوابیدہ صفات کو جنھیں حالیؔ کبھی نہیں ظاہر کرنا چاہتے تھے، دفعتاً اس دھماکے سے ہر طرف بکھیر دیا ہو جیسے بڑی طاقتور بارود سے بھری ہوئی کوئی سرنگ پھٹ جائے۔ اس مرثیے میں حالیؔ نے اپنے کرب کا اظہار الفت و عقیدت و افتخار کے ان تمام رشتوں کے ٹوٹنے سے کیا ہے جن سے حالیؔ جیسا انسان ملک، معاشرہ، خاندان، اشخاص، اور اقدار سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتا تھا۔ حالیؔ کا مرثیۂ غالبؔ اور اقبالؔ کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" ایسی نظموں کی یاد دلاتے اور نمونے پیش کرتے ہیں جہاں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مرحوم کی مفارقت کے کرب کے سوا محروم نے کوئی اور وسیلۂ اظہار مثلاً زبان و بیان، صنائع و بدائع، صوت و صورت، نقل و حرکت اختیار کیا ہو۔ اظہار و ابلاغ کی کامیابی کی یہ معراج ہے۔ فن کا کمال ہی یہ ہے کہ فن کے سارے وسائل کام میں لائے گئے ہوں لیکن ان میں ایک بھی توجہ پر بار نہ ہو۔ مرثیہ نگاری کی انجیل میں یہی ہدایت ملے گی اور مرثیے کی برتری اور بقا اسی میں مضمر ہے۔

ڈرتا ہوں کہ تحمل و درگذر کا جو ذخیرہ آپ نے آج شام میرے لئے محفوظ کر لیا تھا وہ کہیں ختم نہ ہو چکا ہو ورنہ اس مرثیے کے چند بند آپ کی خدمت میں ضرور پیش کرتا لیکن چاہتا ضرور ہوں کہ آسانی سے کہیں یہ مل جائے تو آپ اس کا مطالعہ ضرور فرمالیں۔ آپ کو حالیؔ اور غالبؔ دونوں سے ہمدمی کا ایسا قریبی، نازک اور حزیں احساس ہو گا جو شاید پہلے نہ ہوا ہو!

خطبۂ دوم

غالب کی شاعری

جنابِ صدر، خواتین و حضرات!

فرجامِ سخن گوئیِ غالب، بتو گویم
خونِ جگر است از رگِ گفتار کشیدن!

انگریزی کے کسی ادیب یا دانشور غالباً ای۔ ایم فارسٹر کا قول ہے کہ روزِ حشر حضورِ باری تعالیٰ میں یورپی تہذیب کی نمائندگی یا جوابدہی کے فریضے کو ادا کرنے کا مسئلہ اٹھا تو ہم بلا تکلف شیکسپیئر اور گوئٹے کا نام پیش کریں گے۔ اس آزمائش سے ہم آپ دوچار ہوں تو شاید اتنے ہی وثوق سے غالب اقبال اور ٹیگور کا نام لیں گے۔ ان کے کلام کے آئینہ خانے میں ہماری تہذیب کی پوری جلوہ گری ملتی ہے۔ تہذیب کا اعتبار ان اقدار سے متعین ہوتا ہے جن کی وہ نمائندگی کرتی ہے اور اقدار کا سرچشمہ ذہنِ انسانی کا وہ شعور ہے جو ذات و کائنات کے عرفان سے عبارت ہے۔ ذہن فرد کا ہوتا ہے اور وہی وسیلہ ہے کائنات اور انسان کے ادراک کا۔ چونکہ زمانی و مکانی اعتبار سے انسان کی حیثیت مخصوص و محدود ہے، اس لئے اس کے ادراک و علم کی بھی حیثیت اضافی ہے، مطلق نہیں۔ مطلق علم اصلاً صرف اس ہستی کو حاصل ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے جو زمان و مکان کے قیود سے باہر اور بلند ہو اور جسے ہر امکانی قوت و قدرت پر دسترس ہو۔ اس کے باوجود انسانی ذہن کی نفسی کیفیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مطلق کے تصور کی مدد سے کائنات اور اشیاء کی غایت، کیفیت اور عمل کی تفہیم و تعبیر کی آرزو رکھتا ہے۔ درحقیقت مطلق کے تصور کے بغیر، انسانی فکر کا نہ کوئی مقصد رہ جاتا ہے نہ محور۔ ایسی صورت میں فکرِ انسانی کا وظیفہ صرف معلومات فراہم کرنے کے مترادف ہوگا۔ وہ صرف یہ معلوم کر سکے گی کہ یہ سب کیسے ہے۔ ایک حد تک شاید یہ بھی کہ یہ سب کیا ہے۔ لیکن انسانی ذہن یہ دریافت کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ یہ سب کیوں ہے۔ اس عظیم و حسین استفہام کو غالب نے کس سادگی و پرکاری سے پیش کیا ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبری کیوں ہے؟ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

استفہام کے اس جمالی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کا جلالی پہلو وہ عظیم انحراف ہے، جس کے مرتکب "خواجۂ اہلِ فراق" قرار پائے ہیں۔ جن کا ذکرِ خیر اقبال کے ہاں جا بجا ملتا ہے۔ ہر بڑے شاعر میں اس انحراف کا پایا جانا ضروری ہے۔ کیا عجب روزِ ازل انکارِ ابلیس کی صدائے بازگشت ہر بڑے شاعر کی روح میں جاگزیں ہو۔ مشیتِ الٰہی بھی شاید یہی رہی ہو۔

مذہب، آرٹ، ادب اور فلسفہ اسی "کیوں" کی شمع کو اپنے اپنے فانوس میں گردش دیتے رہتے ہیں۔ "کیوں" کا مسئلہ آدم کی گندم چشی کی پاداش ہے یا انعام، یہ بتانا مشکل ہے۔ لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جستجو ادب میں مسائل اور معنی آفرینی سے عبارت ہے جو وجود انسانی کے لامتناہی غیر منقطع اور کثیر الانواع مشاہدات تجربات احساسات اور آرزوؤں کا احاطہ کرنے اور اس کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ جستجو خارجی حقائق یعنی اشیاء کائنات بہ شمول زمان و مکان سے بھی تعلق رکھتی ہے اور داخلی احوال سے جو غیر مرئی محدود اور جبلت انسانی سے متعلق ہوتے ہیں اُن کے احتساب و اظہار و ابلاغ سے بھی۔ اقبال نے اس تمام انسانی تگ و تاز کو اپنی مشہور نظم "جبریل و ابلیس" کے اس مشہور مصرع میں بیان کر دیا ہے۔

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

غالب اپنی شاندار خاندانی روایات کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا مقصد اپنے کسی احساس کمتری کو چھپانا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کمتری کا وہاں دور دور دخل نہیں ہے۔ دوسری طرف اپنے احساس برتری کی تسکین بھی نہیں چاہتے کہ وہ واقعی برتر تھے۔ برہمی یا بددلی کے عالم میں کبھی کہہ دیا یا کر ڈالا، تو یہ قابلِ اعتنا نہیں۔ غالب صرف اس امرِ واقع کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ایک شاندار روایت کے امین اور نقیب ہیں۔ اس طور پر وہ اپنی شخصیت اور شاعری کے اس پس منظر کو پیش کرتے ہیں جس کا احاطہ کئے بغیر نہ ہم ان سے روشناس ہو سکتے ہیں نہ ان کی شاعری سے بہرہ مند۔ اس معاملے میں غالب نہ بے جا تکلف سے کام لیتے ہیں نہ خواہ مخواہ اپنے کو ہمہ وقت اور ہر جگہ حاضر و ناظر رکھنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے کو روشناسِ خلق رکھنا چاہتے ہیں۔ غالب کے زمانے میں آبا و اجداد پر فخر کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا اس لئے کہ ان کے زمانے میں آبا و اجداد اس کی کوشش کرتے تھے کہ ان کے کارناموں پر انکی اولاد فخر کر سکے۔ اب اگر ان کو معیوب سمجھا جاتا ہے تو ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ احساسِ تفاخر جس ریاضت و عبادت اور احساس ذمہ داری کا تقاضا کرتا ہے، وہ ہمارے بس کی بات نہ ہو۔ اسلاف و اخلاف یا باپ اور بیٹے کے اتفاقی یا طبیعی نہیں بلکہ ارتقائی رشتے کی وضاحت غالب نے ایک جگہ یوں کی ہے:

فرزند زیرِ تیغ پدر می نہد گلو
گر خود پدر در آتشِ نمرود می رود

کسی اور شاعر کا یہ بیان بھی ذہن میں رکھیے۔

آوازۂ خلیل ز بنیادِ کعبہ نیست
مشہور گشت زانکہ در آتش نگونشست

اس امر کو آج کل کے باپ بیٹے (قدیم و جدید) سمجھ لیں تو زندگی کے کتنے فضیحتے دور اور کشاکش کم ہو جائے۔

غالب نہ صرف ایک عظیم تہذیب اور روایت کے امین ہیں بلکہ عظیم تر تہذیب و روایت کے خالق بھی ہیں۔ ان کی روایت، ان کی شاعری ہے اور ان کی تہذیب، ان کی انسانیت دونوں لازوال حسن اور قدر و قیمت کے حامل۔ غالب اور ان کے عہد کو نظر میں رکھیں تو ہم آج ان سے سو ڈیڑھ سو سال کے فاصلے پر ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت اور شاعری کی کرامت کو دیکھئے کہ پہلے سے زیادہ آج ہم ان کو حاضر الوقت پاتے ہیں۔ اردو کا کون ایسا قابل لحاظ شاعر اور ادیب ہے جو آج بھی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا ذہن غالب کے تصرف سے آزاد ہے۔ اور یہ باوجود اس کے کہ غالب کا ادبی سرمایہ اوروں کے مقابلے میں بہت مختصر ہے۔ انہوں نے ڈرامے، ناول یا افسانے نہیں تصنیف کئے۔ مرثیہ نگاری نہیں کی۔ باضابطہ طور پر نہ فن تنقید کو اپنایا نہ مرقع نگاری کی، نہ انشائیے لکھے اور نہ کوئی قاموس اصطلاحات مرتب کی۔ نہ فنون لطیفہ پر کوئی مقالہ لکھا۔ لیکن ہر ساز اور نغمے میں اسی خانہ خراب کی آواز ملے گی۔ اسی کا خون جگر کہیں رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے، کہیں آنکھوں سے ٹپکتا ہے۔ غالب ہماری تہذیب اور ہمارے شعر و ادب کا ایسا جوہری عنصر بن گئے ہیں جو مسلسل و مدام نابکار رہتا ہے۔ اس کے سلاسل عمل و ردِ عمل سے اردو ادب اور اس کے ادیب مرتعش ہوتے ہیں۔ کہیں "بجلوہ ریزیٔ باد" کبھی "بہ پرفشانیٔ شمع"

غالب نے ایک جگہ اپنی ایک آرزو کا اظہار یوں کیا ہے:

مجھکو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

ان کا ارمان کہ ان کو نالۂ بلبل کا درد ملے، یقیناً پورا ہوا لیکن ان کی دوسری آرزو بھی یعنی خندۂ گل کا نمک، محبوب کے حق میں پوری ہوئی ہو یا نہیں۔ ان ہی کے حصہ میں آئی۔ زندگی کا افسانہ و افسوں اسی نالۂ بلبل اور خندۂ گل سے عبارت ہے اسی درد و نمک کی حیرت انگیز اور بے مثل آمیزش سے غالب کی شخصیت کا خمیر اٹھا ہے اور ان کی شاعری میں آب و رنگ آیا ہے۔ اعلیٰ مذاقِ شعری کی ترتیب، تشکیل اور تہذیب کا محرک اعظم یہی توافق و توازن ہے۔ غالب کی ہر بات میں ایک بات، اسی کی دین ہے۔ حیات انسانی کی عجیب خصوصیت ہے کہ وہ بیک وقت ارضیت و ماورائیت دونوں میں پیوست ہے جس کی بنا پر تقدیر انسانی ایک ایسی صورت و معنی ہے جو کبھی سادہ نظر آتی ہے کبھی پر پیچ، کبھی یکرنگی اختیار کرتی ہے کبھی متنوع نظر آتی، کبھی افلاک میں گم معلوم ہوتی ہے کبھی زمین میں پیوست ملتی ہے، کبھی وہم و خیال ہے کبھی حقیقت روبرو۔ بالفاظ دیگر ہماری شخصیت عالم حقیقی اور عالم خیال میں مستقلاً عمل رد و قبول سے عبارت ہے۔ اس رد و قبول میں ہر شخص آزاد ہے۔ ترک و انتخاب اس کا ہوتا ہے خواہ وہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر۔ شخص اور اس کے کارنامے کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا یہ رد و قبول اس کو بالآخر کس طرف اور کہاں لے جاتا ہے یعنی مجموعی طور پر وہ ہم کو صداقت، عدل، خیر، حسن، علم، شرافت، شائستگی یعنی انسانیت سے قریب و ہمکنار کرتا ہے یا اس سے دور لے جاتا ہے۔ موجودہ تقریباً غالب کی زندگی اور شاعری

کو اسی میزان پر تولنے کی ایک ناتمام سی کوشش ہے اور بس!

جدید عہد کا ایک بڑا مسئلہ جو علوم و فنون کی بے پناہ ترقی اور اضافے سے پیدا ہوا ہے، یہ ہے کہ ہم اقدارِ حیات مثلاً صداقت کے تعین یا اس کا احاطہ کرنے کے لئے کیا ذرائع یا اصول کام میں لائیں جو ہم کو کسی متفقہ نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، علم و آگہی کے حاصل کرنے کے طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی طریقے اور ذرائع مختلف ہوتے ہیں جن کی بنا پر مختلف نتائج سامنے آتے ہیں جن کی مزید وضاحت اور تنقید کے بے شمار امکانات ہیں۔ جدید تمدن خاص طور پر مستقبل میں اس کے ارتقاء کے امکانات کو مدِ نظر رکھیں تو ایک ایسے تمدن کی نشاندہی ہوتی ہے جو کلیتہً زائیدۂ سائنس ہوگا۔ اس طور پر آئندہ زمانے میں انسانی تہذیب کے ماضی کے سارے سرمائے کی افہام و تفہیم، تفسیر و تعبیر اور اس کی قدر و قیمت کا تعین ان اصولوں اور ذرائع کی مدد سے کیا جائے گا جو سائنس کے دین ہوں گے۔ یہ کہنا کہ یہ اچھا ہوگا یا برا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ یہ صورت اس کی متقاضی ہے کہ ہم طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی ذرائع علم و آگہی کی نوعیت کے بارے میں مسلسل معلومات بہم پہنچائیں تاکہ ہم انسانی ترقی کی ناقابل تقسیم، عالمگیر اور تخلیقی تحریک کی نئی راہوں کو دریافت کرنے اور ان پر گامزن ہونے کی اہلیت اور حوصلہ پیدا کر سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے عہد کے مستعدد مستند ذہنوں نے ان مسائل پر سوچنا شروع کر دیا ہے۔

اس سلسلے میں غور طلب بات یہ ہے کہ علوم انسانی کی مختلف شاخوں کی نشو و نما کس طرح ہوتی ہے۔ اس سوال سے قطع نظر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ گذشتہ تین سو برس میں بہ مقابلہ دوسرے علوم کے سائنسی علوم کی نشو و نما زیادہ اور نسبتاً واضح اور مخصوص خطوط پر ہوئی ہے۔ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے سائنس داخلی اور خارجی علوم میں امتیاز اور تفریق کرتی ہے۔ پھر بھی یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ہر علم کی بنیاد اصلاً ابلاغ پر ہے۔ اس ابلاغ کے ذرائع سائنس کے کچھ اور ہیں، ادب آرٹ اور فلسفے کے کچھ اور لیکن ان کا اصل مقصد جیسا کہ ایک دانشور نے بتایا ہے، ایسے پُل بنانے ہیں جو اس صداقت تک پہنچنے میں مدد دیں۔ جس کو ایک ایسی حقیقت قرار دیا جا سکے جو قابل اظہار و ابلاغ ہے۔ اگر سائنس کے ذرائع منطقی استدلال، پیمائش اور اعداد ہیں جو معروضی حقائق کے تعین اور تفہیم میں مدد دیتے ہیں تو شعر و ادب کے ذرائع وہ تجربات و احساسات ہیں جن کی تصدیق ذہن و شعور انسانی سے ہوتی ہے۔ اس ضمن میں غالب کی شخصیت اور شاعری کے مطالعے سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ہماری داخلی حیاتی زندگی کا جو احساسات واردات، کیفیات اور جذبات' بالفاظ دیگر جملہ ذہنی تجربات سے عبارت ہے، نہایت جامع، حقیقت آمیز، گہرا، دلپذیر، متنوع اور معنی آفریں اظہار و ابلاغ کیا ہے۔ اس سے ہمارے ادب میں دائمی قدر و قیمت کے ادبی اقدار کی تخلیق میں بیش بہا مدد ملی ہے۔ غالب سے ہماری روز افزوں دلچسپی اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ آج بھی ہمارے ذہنی سفر میں ایک ایسے مفید رفیق و رہبر کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی موجودگی سے اس سفر کی اہمیت اور دلچسپی میں بڑے خوش گوار اضافے کا احساس ہوتا ہے۔

آرٹ، ادب اور اس قسم کی دوسری سرگرمیاں اصلاً انسان کے جمالیاتی احساس و شعور کی ترجمانی، نمائندگی اور اظہار سے تعلق رکھتی ہیں مذہب کا اعلیٰ ترین تصور اسی احساس و شعور سے متعلق ہے جو عقل اور وجدان کی آمیزش سے ایک ایسے تجربے کی حیثیت اختیار کرتا ہے جس کی براہ راست تصدیق کبھی اس جذبۂ طمانیت سے ہوتی ہے جو مجموعی طور پر انسانی شخصیت کی آسودگی کا باعث ہوتا ہے یا جو کبھی

ایسی امنگ یا تڑپ ہوتی ہے جس کی گرمی و گداز سے حسن خیال اور حسن عمل کا ظہور ہوتا ہے۔

جمالیاتی احساس کا تجزیہ کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ یہ مختلف عناصر کا ایک نہایت پیچیدہ مرکب ہے، جس کے نمو اور افزائش میں فکر، مشاہدہ آرزو، علم اور تجربہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے ادبی تخلیقات بالخصوص شاعری کی قدر و قیمت متعین کرنا آسان نہیں ہے۔ برخلاف اس کے سائنسی تخلیق یا عمل کے ذرائع یا معیار متعین کرنے میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ ان کو معروضی عملی تجربے یا ریاضیاتی پیمائش کی مدد سے صحیح یا غلط قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ سائنس ان حقائق اور ان کے امکانات سے بحث کرتی ہے، جن کا وجود ایک ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ سائنس ایک ایسی کائنات یا اشیائے کائنات کے زمان و مکان، جسامت و ضخامت، عناصر و عوامل اور کسر و انکسار کی تحقیق اور جستجو سے تعلق رکھتی ہے جس کا اسے علم ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس داں اس دنیا کی دریافت اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے جس کی تخلیق ہوچکی ہے۔ اور اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن شاعر ادیب، موسیقار، مصور اسی کائنات کی مخلوق ہوتے ہوئے نئے جہان اور نئے کائنات کی تخلیق پر قدرت رکھتے ہیں جن کے یزدان و اہرمن ارض و سما، لمس و لذت، کشش و گریز اور حضور و سرور کا خالق خود شاعر ہوتا ہے۔ شاعر کے اس جہان میں ہم ان حقیقتوں، آرزوں اور بصیرتوں سے آشنا ہوتے ہیں جو انسان کے شائستہ ذہن، ذوق و ظرف کی مستقبل اور مسلسل آبیاری اور سیرابی کا باعث ہوتی ہیں۔ ہمارے ادب میں غالب اور ان کی شاعری نے ایک ایسے جہان معنی کی تخلیق کی ہے جس میں ہماری تہذیبی زندگی کے لالہ کار و تازہ کار رہنے کے امکانات روشن تر ہو گئے ہیں۔

آپ مجھ سے متفق نہ ہوں تو اور بھی اس امر پر غور فرمائیں کہ ہمارے آج کے شاعر اور ادیب اپنی تہذیب کے بالخصوص اور تہذیب انسانی کے بالعموم ان عناصر کی تلاش میں اتنی کاوش کیوں نہیں کرتے جن کے انکشاف اور بازیافت سے شاعر اور شاعری دونوں گرانمایہ اور تازہ کار رہتے ہیں۔ کیا انسانی زندگی میں عصری رجحانات یا ہیجانات اتنے اہم ہیں کہ ہم کلیۃً ان ہی کی عکاسی میں سرگرداں یا اسیری میں بے دست و پا رہیں۔ اگر نری تقلید، ایک جامد اور مجہول ذہن کی غمازی کرتی ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ نری جدیدیت (اس کو عام معنوں میں استعمال کر رہا ہوں، کوئی اصطلاح پیش نظر نہیں ہے) فکر کے انتشار و اختلال کا اظہار کرتی ہو۔ اگر اول الذکر گلدستۂ طاق نسیاں ہو جاتے ہیں اور موخر الذکر آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک، تو وہ نیا آدم کہاں سے آئے گا جو قصۂ جدید و قدیم کو دلیل کم نظری بتائے گا اور چمن حیات کی آبیاری کے لئے ساقی سے آب بقائے دوام کا طلب گار ہوگا جس کے لئے خود لب ساقی پر مکرر صلا ہے کوئی اور ہوتا یا کہیں اور کی بات ہوتی تو کہتا غالب کو ڈھونڈو یا اقبال کو لاؤ۔ آپ سے کیا کہوں جس کے ہاں دونوں ہیں۔

عام تاریخ کی طرح ہر زبان کی تاریخ شعر بھی دو دائرے میں اپنا تکملہ کرتی ہے۔ شعر سادگی سے ابھرتا ہے۔ ابتدائی دور کے فنکار دل سے نکلے اور دل میں اترے کے قائل ہوتے ہیں۔ ان کا سیدھا سادا زبان کا جذباتی لہجہ ہوتا ہے، اس کا روز مرہ ہوتا ہے۔ وہ بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" بہت جلد ترصیع کاروں کا ہجوم نکل پڑتا ہے۔ جن کی ہر بات میں ایک بات ہوتی ہے۔ وہ شعر کی تزئین و آرائش کرتے ہیں۔ آرائش کے زیور اور لباس سے سادہ و معصوم حسن گرانبار ہو جاتا ہے اور آرائش و زیبائش وسیلہ نہیں مقصود

بن جاتی ہے۔

اردو تاریخ شعر میں دکنی شاعری کا دور اس کا ابتدائی دور کہا جا سکتا ہے۔ ابن نشاطی سے دوسری روایت شروع ہو جاتی ہے۔ دہلی والوں نے شعر کا سرا پھر وہیں سے اٹھایا ہے جہاں محمد قلی قطب شاہ، وجہی اور غواصی نے چھوڑا تھا۔ لکھنؤ جاکر اردو شاعری پر ترصیع و تکلف کا غلبہ ہوتا ہے جس کے سیل کو شاہ نصیر اور ذوق کی محاورہ بندی بھی نہ تھام سکی۔ تاریخ شعر کے ایسے مقام پر اکبر آباد کا ایک نوجوان دہلی کی بساط شعر پر تازہ وارد کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے۔ اکبر آباد میں اس کی تربیت نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں نہیں بلکہ بیدل، ناصر علی، نظیری، عرفی اور ظہوری کے دبستان میں ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز تک اردو زبان بھی اپنے ارتقا کے ایسے مرحلے پر پہنچ گئی تھی جہاں اس کے ہندی اور فارسی اجزائے ترکیبی میں جمود سا آگیا تھا۔ یہ وسعت طلب تھی لیکن شعرائے دہلی اسے محاورہ بندی میں قید کر رہے تھے۔ لکھنؤ کا دبستان اس کے حسن ظاہری سے کھیل رہا تھا۔ فکر و ہیئت کی توسیع کی جانب کسی کی توجہ نہیں تھی۔ غالب جن کے شاعرانہ ذہن کی سب سے بڑی خصوصیت نغز گوئی اور جدت طرازی تھی، نہ زبان سے مطمئن تھے، نہ اسلوب شعر سے۔ ان کا ماحول نظیر اکبر آبادی کے عوامی ماحول سے بالکل مختلف تھا۔ اس لئے کہ لڑکپن میں وہ اکبر آباد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں نہیں، محلسراؤں اور ایوانوں میں کھیلنے والوں میں تھے۔ اردو کے عوامی ادب سے ان کو مطلق سروکار نہ تھا۔ ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں اپنے ہی نسب کا خیال جاگزیں نہیں تھا، اردو کو بھی وہ ایک نسب دینا چاہتے تھے، اپنا ہی نسب۔ یعنی ایران و عجم کا نسب ایسا انھوں نے کر دکھایا۔ زبان اور شعر و ادب کی تقدیر کو اس طرح بدل دینے اور چمکا دینے کا امتیاز بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہوگا

شیفتہ کی طرح شاید غالب کا بھی نظیر اکبر آبادی کے بارے میں یہی خیال رہا ہو گا کہ "شاعر سوقی است" یوں بھی غالب کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں حرج نہیں کہ وہ جس کسی کو غیر سوقی سمجھتے ہوں گے اس پر ان کا غیر معمولی کرم ہوتا ہو گا۔ چنانچہ اپنے ترکی نسب پر فخر کرنے والا یہ پسماندۂ اشراف یا خلاصۂ اسلاف اس پر کب رضامند ہو سکتا تھا کہ کسی اندازِ سوقی کو اپنائے یا دلی والوں کی مانند محاورے کے ہاتھ منہ توڑے اس کی اپج اور شاعرانہ انفرادیت بالآخر متاخرین شعرائے فارسی کی طرف مائل ہوئی۔ ان شعرا اور بیدل کے سامنے غالب کی کیفیت ایک "طفل بد معاملہ" کی سی تھی۔ جس کے سر سے اس کا عصا بلند ہو۔ غالب کی ابتدائی شاعری کی کوئی فنکارانہ قدر و قیمت ہو یا نہ ہو، ان کے جدت طراز ذہن کو رنگ بیدل میں تسکین ضرور ملتی تھی، یہی لئے کہ وہ نہ تو "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا" کے شاعر تھے نہ "پگی بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا" کے شاعر۔ جو اسلوب دوسرے شاعروں کے لئے باعث شہرت تھا اسے اپنے لئے وہ باعث لعنت سمجھتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "اسد اور شیر اور خدا اور جفا اور وفا میری طرز گفتار نہیں" یہ کوچۂ بیدل میں غالب کی تربیت ضروری تھی یا نہیں یا اس سے ان کے دوسرے دور کی شاعری میں پرکاری آئی یا نہیں، اس کا بتانا بعض اعتبار سے مشکل ہے۔ غالب طرز بیدل کے قائل تھے۔ نسخۂ حمیدیہ میں غالب کے جتنے اشعار درج ہیں، ان میں سے بیشتر میں بیدل کا رنگ واضح طور پر ملتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس امر کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ غالب بیدل کے کتنے ہی قائل کیوں نہ رہے ہوں، انہوں نے ایک جگہ "طرزِ بیدل بجز تفنن نیست" بھی کہا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، غالب کے کلام میں سادگی و پرکاری بیدل کی دین نہیں ہے۔ اس لئے کہ بیدل کا کلام چاہے جو کچھ اور ہو، سادہ و پرکار نہیں ہے دقیق اور اکثر بے ضرورت دقیق ہے اور سادگی و پرکاری کا نقیض ہے۔ غالب کی شہرت کا سبب ان کا متداول مختصر د

منتخب مجموعہ ہے، نسخۂ حمیدیہ نہیں سادگی اور پُرکاری غالب کی بالکل اپنی ہے۔ کسی کے اسلوب کی تقلید سے آج تک کوئی شاعر یا فنکار مجتہد یا معظم نہیں مانا گیا۔

غالب کن فارسی شعرا سے متاثر ہوئے، اس پر ان کے ابتدائے عہدِ شاعری سے بحث چلی آرہی ہے۔ حالی نے جو غالب کے معتبر شاگرد و سوانح نگار اور بذات خود شعر و ادب کے اچھے مبصر مانے جاتے ہیں۔ غالب کا موازنہ بعض ان نامور فارسی شعرا سے کیا ہے جنھوں نے ہندوستان آکر اور ہندوستان میں رہ کر اپنے کلام سے ہم کو مستفید و متاثر اور ہندی فارسی شعر و ادب کو مالا مال کیا۔ ان سے بہرہ مند ہونے کا خود غالب نے بڑی فراخدلی سے جابجا اعتراف کیا ہے۔ بعض حلقوں میں اس پر زور دیا جارہا ہے کہ غالب پر بیدل کی گرفت بنیادی اور غیر منقطع ہے۔ اس کی تائید میں جو شواہد پیش کیے جاتے ہیں اس سے انکار نہیں۔ لیکن غالب کے اردو فارسی کلام، ان کے خطوط اور ان کے بعض بیانات کو نظر میں رکھیں تو معلوم ہوگا کہ غالب نے اپنے نامور پیش رؤوں سے کتنا ہی کیوں نہ استفادہ کیا ہو، وہ بنیادی اور غیر منقطع طور پر غالب ہی ہیں۔ غزل پر غزل کہنے، یکساں تراکیب و تلازمہ، رموز و علائم، استعمال کرنے یا کبھی کبھی سوچنے کا یکساں انداز اختیار کرنے سے، کوئی شاعر دوسرے شاعر کا لازماً مقلد نہیں بن جاتا۔ شعرا کبھی کبھی اس طرح بھی طبع آزمائی یا دوسروں کے میدان میں زور آزمائی کرلیا کرتے ہیں۔ کسی بڑے شاعر یا فنکار کے بارے میں اب تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ اپنے بجائے کسی اور کے سہارے پر کھڑا ہے۔ غالب سے قطع نظر، حالی، اکبر اور اقبال کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی کے مقلد یا خوشہ چین ہیں۔ وجہ کوئی ہو، بیدل کی پیروی آج تک کسی معروف فارسی شاعر نے کی نہ اردو شاعر نے۔ آخر کیوں؟

بیدل کی غزلوں سے کہیں زیادہ دوسرے اکابر شعرا کی غزلوں پر غالب نے طبع آزمائی کی ہے لیکن کسی کے مقلد نہیں قرار پائے۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر فنکار اوسط یا معمولی درجے کا ہے تو وہ اپنے پیش رو تک یا اس سے بھی پیچھے رہ جاتا ہے اور اپنے قد و قامت میں کوئی اضافہ نہیں کرپاتا۔ لیکن اگر اس کی تخئیل میں تازگی، جذبے میں حرارت اور فکر میں توانائی ہے اور وہ جودت و ندرت ہے جسے انفرادیت کہتے ہیں تو وہ اپنے پیش رؤوں کے چھوڑے ہوئے وسائل سے ضرور کام لیتا ہے۔ لیکن اس کی سمت و رفتار اور منزل مقصود سب جدا گانہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے مسلک کا مجتہد یا شریعت کا امام قرار پاتا ہے۔ غالب ایسے ہی فنکار ہیں۔ غالب نے اپنے پیش رو اکابر شعرا کے کلام کو ذہن میں رکھ کر اپنے کلام کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ کمتر کسی سے نہیں ہے، یا تو برابر ورنہ بہتر ہے۔ غالب کا فارسی کلام بیدل کے رنگ سے خالی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فارسی یا اردو شعرا میں سے کسی قابل لحاظ شاعر نے بیدل کی پیروی نہیں کی۔ بیدل کی شاعری ہمارے آپ کے لئے کتنی ہی حرکی ہو، وہ کسی شاعر میں حرکت نہ پیدا کرسکی۔ حالانکہ معمولی درجے کے شعرا ہر حرکت پر قادر ہوتے ہیں۔ غالب کی جینیس بیدل کی جینیس سے بالکل علیحدہ ہے۔ غالب جتنے حسیات کے شاعر ہیں اتنے مجردات کے نہیں۔ شخص اور شخصیت کے اعتبار سے بھی غالب، بیدل سے جدا ہیں۔ بیدل بہ روایت خود، خوارق عادات پر قدرت رکھتے ہیں۔ غالب بتان خود آرا، بادہ ہائے ناب و گوارا، صاحبان انگریز اور رؤسائے عظام کے قائل تھے۔ بڑے شاعر راست کبھی نہیں ہوتے، پیغمبر ہمیشہ رہتے ہیں۔

سادگی کے ساتھ یہ پُرکاری غالب کے آخری دور شاعری تک قائم رہی۔ اسی نے مرزا غالب کو "انداز بیاں اور" کا مرتبہ بخشا ہے

غالب سے پہلے اردو شاعری یا تو انداز بیان کی شاعری تھی یا زبان کی۔ اردو شعرا ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے تجرباتِ حیات محسور اور جن کا علم محدود ہوتا تھا۔ روایت پسندی ان کے مزاج میں داخل تھی اس لئے کہ روایت کے ذریعے وہ بازار اور دربار دونوں میں جلد مقبولیت حاصل کر لیتے تھے۔ شاعری ان لوگوں کے لئے ذوق و ذہن کے تقاضے، ان کا کسر و انکسار یا خود کو پالینے کی کاوش نہیں بلکہ ایک طرح کی میکانیکی سہل انگاری بن گئی تھی۔ شاعری سے زیادہ استاد کا اقتدار یا پہلوانانِ سخن کا دور دورہ تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں غالب نے خانہ داماد کی حیثیت سے دہلی میں قدم رکھا اور دہلی والوں کو عصائے بیدل سے ہانکنے کی کوشش کی تو دہلی والوں کا عام ردِ عمل وہی تھا جو ان کے ایک عام مستعمل لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے یعنی اکبر آباد کا بانگڑو۔[1] غالب نے اہل دہلی کو سخنورانِ جاہل سمجھا اور وہ مرزا نوشہ کو خدا کے سپرد کرتے رہے "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے"۔ بعد میں مرزا نے انہیں سخنورانِ جاہل کو سخنورانِ کامل کہا۔ بہر حال نو وارد کے ذہن پر دلی والوں کا جو نقش بیٹھا تھا وہ ان کے اس دور کی شاعری میں اس طرح نمایاں ہے:

دلی کے رہنے والو اسدؔ کو ستاؤ مت

بے چارہ چند یوم کا یاں میہمان ہے

غالب کی زندگی میں دہلی والوں سے مقابلہ شکست و فتح دونوں کا منظر پیش کرتا ہے۔ ابتدا شکست سے ہوئی اور گفتۂ غالب کو سننے اور پڑھنے والے نایاب رہے۔ بہ قول ان کے:

ہمارے شعر میں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

دوسرے دورِ شاعری میں غالب کی فارسی کی جانب رغبت و انہماک کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اہل دہلی نے ان کے کلام ریختہ کی قدر دانی نہیں کی۔ فارسی کا ذوق خواص دہلی تک محدود تھا۔ دہلی کا یہ "ادبی اشرافیہ" غالب کا ہمیشہ معتقد رہا۔ لیکن غالب کی مشکل یہ تھی کہ اپنے فارسی شعر کے ذریعے وہ قلعۂ معلی تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جہاں ریختہ ذوقِ ادب کا جزو بن چکا تھا۔ جہاں سخن فہم شاہ ظفر تھے اور سخن گو استاد ذوق۔ ایسی فضا میں غالب کو نہ کوئی طرفدار مل سکا، نہ شہ کی مصاحبت حاصل ہو سکی۔

غالب کی انانیت کے لئے یہ چیلنج تھا۔ ایسی انانیت کے خلاف جس کی پرورش نسلی تفاخر اور علمی پندار کے ماحول اور روایات میں ہوئی تھی۔ غالب سے قبل نامور اردو شعرا دربار سے بھی اٹھتے رہے اور بازار سے بھی۔ سپاہی پیشہ بھی ہوئے ہیں اور سجادہ نشین بھی۔ لیکن غالب کا تعلق عمائدین کے ایک ایسے طبقے سے تھا جس کے ہاتھوں سے مال و منزلت دونوں جا چکی تھی اور حسرت و پندار رہ گئے ہوں۔ غالب کے حزن اور رشک دونوں کا ماخذ و منبع یہی طبقاتی احساسِ زیاں تھا۔ ان کی زندگی کا یہی المیہ تھا۔ ان کی حسرتیں ان کی حاجتوں سے زیادہ رہیں۔ جس کی جھلک ان کے کلام میں جا بجا ملتی ہے مثلاً:

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یا کس جسارت اور کتنے بے مثل طنزیہ حزنیہ انداز سے شاعرانہ حدود میں رہتے ہوئے کہا ہے:

---

[1] اس زمانے میں اہل دہلی باہر والوں کو اپنا جیسا شائستہ نہیں سمجھتے تھے۔ یوں بھی کھڑی بولی کے لب و لہجے اور کرخنداروں کے لغت میں اس طرح کے میز الفرق کمی نہیں ہے۔ اشراف و عوام یا ہمچو من دیگرے نیست کا جذبہ بھلا ہو یا بُرا، سماجی مسلمات میں رہا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالب کا حزن عشقیہ واردات کا نہیں بلکہ سماجی واقعات و حالات کی پیداوار تھا۔ ان کے کلام میں حزن کی ایک زیریں لے ملتی ہے اور ایک طرح کی شدید ناآسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسے شخص کی حرماں نصیبی ملتی ہے جس کا بچپن اور ابتدائے شباب، شمع و شاہد و شعر و شراب میں گذرا ہو اور نامساعد حالات کے نتیجے میں خود کو

"اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے"

کا مصداق پاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بڑے فن کار تہذیبی زوال کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ غالب کے حزن کو اگر سیاسی اور معاشرتی حالات کے پیش منظر میں دیکھا جائے تب بھی اس صداقت کا احساس ہوتا ہے کہ غالب ایک زبردست شکست و ریخت کے عہد کی پیداوار ہیں۔ جس دلی میں ان کا ورود ہوا تھا، وہ "دل لینے والی" دلی نہ تھی بلکہ ایک اجڑتا ہوا دیار تھا۔ ان کے چاروں طرف شکستگی کا عالم تھا اور اس عالم میں خود ان کی شخصیت کی شکستگی نے المیہ کے احساس کو مکمل کر دیا تھا

ایک ایسی انفرادیت جو "آگہی اور غفلت" دونوں کو اپنی "نسبت" سے دیکھتی ہو اور جس کا حال یہ ہو:

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

وہ ماتم یک شہر آرزو کی صلیب کاندھوں پر اٹھائے نہ پھرے تو اور کیا کرے۔ غالب کے حزن کے بیشتر ماخذ مادی ہیں۔ ان کا غم زیادہ تر "کھائیں گے کیا" کا غم ہے۔ ہرچند کہ وہ غم عشق کا بھی تذکرہ جا بجا کر دیتے ہیں۔ یہ عیش غم بھی ہے۔ فانی نے بھی ایک قطعے میں جو اپنے سنگ مزار کے لئے لکھا تھا "خداداشت" کی طنزیہ شکایت کی ہے۔ غالب نے "ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے" محض اس لئے کہا ہے کہ زندگی اپنی جب اس رنگ سے گذری غالب۔ دوستوں، عزیزوں، شاگردوں اور شاہ و خدا سب سے غالب کے تقاضے بے شمار تھے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ "کس کی حاجت روا کرے کوئی"۔ اقبال کا خیال ہے "کرتی ہے حاجت شیروں کو روباہ" لیکن اسد اللہ خاں کو حاجت ہی نے شیر بنا دیا تھا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

از مہر جہاں تاب امید نظرم نیست　　　ویں تشت پر از آتش سوزاں بسرم ریز

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

پرتبی دستم و بے برگ، خدایا تا چند
بہ سخن شاد شوم کایں گہر از کانِ من است

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

ان اشعار یا اس طرح کے اشعار کو غالب کی حاجت مندی کا معتبر ترجمان بھی نہیں کہہ سکتے تاہم روزگار کے اظہار میں آسودہ حال شعرا کا بھی یہ لب و لہجہ رہا ہے جو اتنا واقعاتی نہیں ہے جتنا روایتی۔ لیکن غالب کے سوانح حیات کے بعض مخصوص سیاق و سباق میں ان اشعار کو نظر انداز نہ کرنے پر کوئی الزام راوی پر بھی نہیں آتا۔

جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ غالب نہ تو الم کے شاعر ہیں نہ ان کی شاعری المیہ ہے۔ تاہم ایک زوال آمادہ تہذیب و تمدن کی پیداوار ہونے کے اعتبار سے ان کے یہاں ایک مہذب الم کی کیفیت ملتی ہے جس کے لئے حزن کا لفظ استعمال کرتا رہا ہوں۔ ان کی شاعری کا عام لہجہ حزنیہ ہے۔ حسرت، داغ، تمنا، بلا، برق وغیرہ کے الفاظ جو ان کی شاعری میں بار بار آئے ہیں، وہ اسی کی غمازی کرتے ہیں۔ اپنے خطوط میں دولت و سلطنت و شہرت سے عام بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ایک "عالم بیرنگی" کہ جہاں "نہ تماشا ہے نہ ذوق کی تماشا ہی ہے"، وہ بھی ایک قسم کے ذاتی حزن کا اظہار ہے۔

غالب کے جذبۂ رشک اور حزن کا ماخذ ایک ہی ہے۔ یعنی ان کی شدید انفرادیت اور مادی ناآسودگی۔ وہ صبر و شکر کی صفات سے ناآشنا تھے اور اسے شخصیت کی کمزوری سمجھتے تھے۔ یہ ناآسودگی اپنی شدید شکل میں بیزاری اور "بے دلی ہائے تماشا" کی کیفیت پیدا کر لیتی تھی لیکن عشقیہ واردات کے بیان میں جب یہ رشک کے انداز میں نمودار ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ غالب سے زیادہ مہذب رشک کرنے والا اردو شاعری میں پیدا نہیں ہوا۔ غالب کے عشقیہ واردات میں کانوں کو اور آنکھوں کو کانوں پر رشک آتا ہے کہ محبوب کے قدموں کی آہٹ یا اس کے حسن کی جھلک پہلے کون پاتا ہے۔ رشک اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ جب انسان خود اپنے سے رشک کرنے لگتا ہے:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غالب کے اس رشک کا تصرف ایک جگہ محبوب تک پہنچ چکا ہے مثلاً:

نخوت نگر کہ می خسکد اندر دلش ز رشک
حرفے کہ در پرستش معبود میرود

بیروں میا ز خانہ بہ ہنگام نیمروز　　رشک آیدم کہ سایہ بہ پابوس میرود

اس رشک کا مورد زیادہ تر خود غالب کی ذات ہے لیکن ان کے عشقیہ واردات میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے:

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھکو بعد قتل　　میرے پتے سے غیر کو کیوں تیرا گھر ملے

غالباً میر جیسا مہذب عاشق اس سعادت کو کبھی ہاتھوں سے نہ جانے دیتا کہ محبوب اپنی گلی میں دفن ہونے کا اعزاز بخش رہا ہے۔ غالب کی انانیت اور جذبۂ رشک کو ملحوظ رکھیئے تو ان کی عشقیہ واردات کی نوعیت خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔ غالب نے اردو غزل کی عشقیہ

ایت کو جو سپردگی، بےچیرزی اور کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل جانے سے عبارت تھی۔ ایک مردانہ آن بان عطا کی۔ وہ ایک بے نیاز عاشق
۔ ان کا بس چلے تو محبوب سے اپنے ناز خود اٹھوائیں۔ دھول دھپے تک تو ان کے عشق کی نوبت ایک ہی بار پہنچی لیکن اپنے ناز اٹھوانے
واردات ان کے یہاں جا بجا ملتی ہے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حسن کو شائستۂ غالب ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ معمولی درجے کے محبوبوں
سے صاف کہہ دیتے ہیں:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

غالب کے اس رشک میں ان کی غیر معمولی نسلی حمیت کو بھی دخل ہو سکتا ہے جس کا وہ اپنے کو نمائندہ سمجھتے تھے۔ غیرت، حمیت اور
شک کا اونچے درجے کے جانوروں اور اعلیٰ قبیلے کے افراد و اشخاص میں پایا جانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ جذبہ اس وقت سے
سرکار ہے جب انسان پہلے پہل تہذیب و تمدن کی سرحدوں میں داخل ہوا ہوگا۔ جب سے اب تک یہ جس کافی کمزور ہو چکی ہے۔ شاید اس
قت معدوم ہو جائے جب وہ تہذیب کی آخری حدود پر پہنچ جائے۔ ان برکتوں کے آثار کچھ تعجب نہیں غالب نے اپنے ہی عہد میں دیکھے
وں جیسا کہ کہا جا چکا ہے غالب کا عشق واردا تی نہیں تصوراتی ہے۔ اس لئے انیسویں صدی میں یہ بیسویں صدی کا عشق تھا جب انہوں
نے کہا:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ں میں مقطع کی بات "مجھ کو بھی پوچھتے رہو" ہے، باقی حسن مطلع۔

موضوعات غزل کا ابدی مثلث، عاشق، محبوب اور رقیب ہے۔ غالب کے ہاں محبوب کا وہ احترام نہیں ملتا جو ہمارے ادب کی روایت
ی ہے۔ رقیب کو بھی وہ نہیں بخشتے اسی بوالہوسی کو عشق اور بوالہوس کے عشق کو بوالہوسی جانا ہے۔ کبھی محبوب کو خدا کے ہاتھ سونپنے میں تامل
رتے ہیں اور کبھی اسے رقیب کے سپرد کر دیتے ہیں۔ غالب کے محبوب کو محترم یا محترمہ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس رند شاہد باز کے
معاملات حسن و عشق کے پس پردہ اکثر کسی "شاہد بازاری" کی موجودگی کا احساس ہوا ہے۔ یہ متوسط طبقے کے شخص کا عشق نہیں۔ اس
ں میر صاحب کے عشق کی خستگی یا کسک اور کھٹک نہیں ملتی۔ یہ "عشرتِ صحبتِ خوباں" کا عشق ہے جس کے سامنے "عمرِ طبیعی" بھی ہیچ ہے۔ کہتے
ہیں۔

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت جانو
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

غالب اس عیش کوشی کے باوجود عمرِ طبیعی پا گئے تاہم ان کے خطوط اور دوسری تحریروں میں آخر عمر کے درد و درماندگی کے جو
ذکرے ملتے ہیں وہ بڑے المناک ہیں۔ سجاد انصاری نے لکھا ہے کہ ان کو متبنّی سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن وہ قرۃ العین کے قاتلوں کا
شر دیکھنا چاہتے ہیں۔ عقبےٰ میرا ایمان ہے اور غالب کو عزیز رکھتا ہوں۔ اس لئے امید ہے کہ غالب کے قاتلوں کا حشر دیکھنے میں مجھے
سانی ہوگی۔

غالب کی تمام شاعری میں اقبال کی مانند عورت مفقود ہے۔ اقبال نے عشق کی واردات غیرارضی یا مابعد الطبیعاتی سطح پر پیش کی۔
غالب کا عشق نہ جنسی ہے نہ رومانی۔ وہ حسرت و عشرت کا عشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں حسن نسوانی کے مرقع نہیں ملتے۔ زلف
کاکل، نگہ اور مژہ ہائے دراز سے قطع نظر، انہوں نے اجزائے یا اعضائے حسن کا تذکرہ کہیں نہیں کیا ہے۔ آنکھوں کے حسن پر جب کہ متقد
اش اش کرتے ہیں۔ غالب سرسری گذر جاتے ہیں۔ دہن برائے بیت ہے اور لب برائے نام۔ لیکن نگہ اور مژہ کی خلش انہوں نے ساری عمر محسوس
کی ہے۔

غالب شاید اردو کے پہلے غزل گو ہیں جنھوں نے "غم روزگار" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ انسان کے لئے غم روزگار اور غم عشق
لازم وملزوم ہیں۔ ایک جگہ تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ غم سے نجات نہیں۔ غم عشق کم ہونے پر بھی غم روزگار چھوڑ جاتا ہے۔ روزے پہ ایما
رکھنا اور خسخانہ و برفاب کی آرزو کرنا عجب سی بات ہے جیسے روزے سے زیادہ روزی عزیز ہو:

چہ برزراعت آزردگی خوری غالب
تراکہ این ہمہ بابرگ وساز باید بود

اس برگ وساز کے لئے تگ و دو غالب کی زندگی کا ایک اہم جزو تھی۔ اسی کی خاطر انہوں نے بہوس سیر و تماشا گم ہونے کے
باوجود سفر کلکتہ کی صعوبتیں اٹھائیں۔ اسی غرض سے انہوں نے کمپنی بہادر کے چھوٹے چھوٹے افسروں کی مدح سرائی کی۔ ایک امید
موہوم پر ملکۂ وکٹوریہ کے حضور میں قصیدہ پیش کیا اور تمام عمر دولت و اقبال کے سایے کو پکڑتے رہے۔ مسٹر سیسل بیڈن سے کہتے ہیں

حیف باشد کز الطاف تو ماند محروم
ہمچو من بندۂ دیرین و نمک خوار کہن

جیمس تامسن کی شان میں ایک قصیدہ نما غزل یا غزل نما قصیدہ ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تابسویم نظر لطف جیمس تامسن است
سبزہ ام گلبن و خارم گل و خاکم چمن است
بے کسی ہائے من از صورت عالم دریاب
مردہ ام بر سر راہ و کف خاکم کفن است

غالب اپنی حاجت کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی غیرت مند ہونے سے زیادہ حاجت مند معلوم ہونے لگتے تھے۔ عرشی
صاحب کے مرتبہ خطوط نے اس نقاب کو جہاں تہاں سے اٹھا دیا ہے جو غالب کی شخصیت پر پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایسے آزاد خو
ہیں کہ

الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

دوسری طرف دوستوں، عزیزوں اور رئیسوں کی داد و دہش کے دروازوں کو تمام عمر کھٹکھٹاتے رہے۔ غالب نے ایک جگہ کہا ہے کہ
خدا ہاتھوں کو شرمائے، یہ برابر میرے گریبان اور جاناں کے دامن کو کشاکش میں رکھتے ہیں۔ کاش کبھی وہ اس پر بھی غور کرتے کہ ان کے پاؤں

چادر کی دائمی کشاکش پر کون کس کو شرمائے۔ غالب معاشی پریشانیوں کے باعث کبھی کبھی شعر و سخن سے اس قدر بیزار ہو جاتے کہ وہ اسے بے بازیٔ
یت سے تعبیر کرتے۔ وہ تمام عمر ایک اکبر ایک شاہجہاں اور ایک ابراہیم عادل شاہ کا خواب دیکھتے رہے اور باوجود اس کے کہ
ری کے سب سے زیادہ معتقد و مداح رہے ہیں، کہتے ہیں:

غالب بہ شعر کم ز ظہوری نیم و لے
عادل شہ سخن رس دریا نوال کو

سخن رسی تو ظفر کے پاس بھی تھی لیکن وہ دریا نوال نہیں ہو سکتے تھے۔ متاع و منزلت کی حسرت غالب کو تا عمر اس حسرت نے
و غزل کو ایک نیا موضوع دیا ہے۔ موضوع سخن کی حیثیت سے غم روزگار کا تذکرہ غالب کی غزلوں میں کافی ملتا ہے۔ غالب کی مقبولیت کا یہ بھی ایک راز
سکتا ہے لیکن جب سے دنیا قائم ہے، روزگار کا غم زندگی کا جزو بن گیا ہے اور ہر کس و ناکس نے کسی نہ کسی طریقے سے اس کا اظہار ضرور کیا ہے
کی شکایت زیادہ اصولی یا عمومی رنگ میں کی گئی ہے، اس لئے شکایت کرنے والے کو کبھی کسی نے قابل مواخذہ نہیں قرار دیا بلکہ عام
ر پر سراہا ہے۔ لیکن آلام روزگار کی شکایت کا نغمہ یا نوحہ غالب کے ہاں اتنے اونچے سروں میں ملتا ہے کہ گھر کی رونق، گھر کی رسوائی
جاتی۔

غالب کی شخصیت انوکھی اور پہلودار نہ ہوتی تو شاید ان کا کلام اس درجہ دل نشیں اور فکر انگیز نہ ہوتا۔ اس تہ دار شخصیت
اظہار کیلئے انہوں نے بڑی جانفشانی اور تجربے کے بعد ایک ایسی "طرح دیگر" اور ایک ایسا "انداز بیان اور" ایجاد کیا جو آجتک اپنی مثال
ہے۔ حالی نے جو حکم غالب کی فارسی شاعری پر لگایا ہے، وہی ان کے اردو کلام کے بارے میں دہرایا جا سکتا ہے کہ اس قدر جامع
یات ادبی شخصیت نے اردو غزل کے میدان میں ظہور نہیں کیا۔ غالب کے اس فنی کمال کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی عظمت کا راز یہ
کہ انہوں نے اردو غزل کی روایات سے حتی الوسع گریز کیا ہے اور اپنی فارسی دانی اور فارسی شناسی سے اردو کو ایک نئی حیثیت،
نئی قامت اور ایک نیا لہجہ بخشا۔ ان کے کلام میں موضوعات کا تنوع ہے اور ہر موضوع کے اظہار میں ان کا مخصوص طرز بیان کارفرما ہے
نا یہاں یہ بھی یاد رکھیے کہ غزل بجائے خود موضوعات کے تنوع کی جنت ہے۔ غالب کے یہاں اقبال کی طرح مباحث یا مسائل کا تنوع نہیں
، نہ ان پر قطعی اور ترشے ہوئے فیصلے ہیں جن کو دیکھ کر یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ بات کسی شاعر نے کہی ہے یا مفکر، محقق، مجتہد یا
معلم نے۔

غالب کے یہاں جذبے کی شدت یا حرارت تو نہیں ملتی جو میر کی شاعری کی جان ہے لیکن غالب کا بہترین کلام جذبے سے
خالی نہیں۔ یہ جذبہ خیال کے تہ دار نقاب میں نمودار ہوتا ہے۔ مثلاً:

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

بظاہر اور بعض ایسے شارحین کے نزدیک جو محض صنائع بدائع کے متلاشی و معترف ہوتے ہیں، غالب نے یہ شعر شمع، شعلہ،

دھواں اور سیاہی کے تلازمے کی خاطر کہا ہے۔ یعنی شعر کی پرداخت تمام تر خیالی ہے لیکن دراصل غالب نے اس پوری غزل میں اپنے مرتبہ
عاشقانہ کا اظہار بڑے ہی بھرپور، دلدوز اور دلنشیں انداز اور لہجے میں کیا ہے۔ اس قبیل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

روایتی شارح یہ کہکر آگے بڑھ جائیں گے کہ مرزا صاحب نے حکایت اور قلم کی خوب رعایت رکھی ہے لیکن یہ شعر صنعت گری کی خا
نہیں لکھا گیا۔ اس کے پیچھے جنونِ غالب اور عشق غالب کا احساس ملتا ہے اور ایک عظیم منصب کو ادا کرنے اور کرتے رہنے کا جذبہ اور حرار
ملتی ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ غالب محض خیال اور فکر کے شاعر ہیں جذبے کے نہیں۔ عظیم غنائیہ شاعری میں جذبے کی گرم
نہیں، روشنی ملتی ہے۔ اس کا احساس غالب کے ان اشعار میں بھی ہوتا ہے جو خالص فکری کہے جا سکتے ہیں۔ مثلاً:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند	گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز	پیشِ نظر ہے آئینہ ہر دم نقاب میں

غالب کی غزلوں کی ندرت ان کے فکری لہجے میں ہے۔ ان کو فلسفی نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ ان کے ہاں اقبال کی طرح کو
منظم فکر نہیں ملتی۔

غزل میں فلسفہ یا منظم فکر یا پیام، نہ ملے تو یہ غزل کو کا قصور ہے نہ غزل کا۔ غزل اس قسم کی کوئی چیز قبول نہیں کرتی اس کی یہ
بھی نہیں ہے۔ اردو کو منظم فکر کی شاعری اقبال کی دی ہوئی ہے۔ غزل میں زیادہ تر شاعر کا "موڈ" ملتا ہے۔ موڈ جلد جلد بدلتا رہتا ہے
فکر نہیں بدلتی۔ موڈ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ فکر طرح طرح کی پابندی اور جوابدہی کے نرغے میں ہوتی ہے۔ بعض شاعروں میں مو
نسبتاً زیادہ طویل ہوتا ہے، جسے ہم غلطی سے "فکر" یا "پیام" کا درجہ دے دیتے ہیں۔

غالب کی مابعد الطبیعاتی سطح وہی وحدت الوجود کی سطح ہے۔ استعارے اور تلازمے بھی وہی ہیں جو اس حقیقت کے اظ
کے لئے فارسی اور اردو شعراء عرصے سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ مثلاً دریا اور قطرے کی نسبت، شمع و پروانہ کی نسبت، ذ
اور صحرا کی نسبت، پرتو خور اور شبنم کا رشتہ۔ انہوں نے مظاہر حقیقت کو بھی "حلقہ دام خیال" سے تعبیر کیا ہے اور کبھی "ہرچند کہیں کہ ہے نہیں
ہے" کہکر ختم کر دیا ہے۔ فلسفی سے زیادہ ان کو اپنے ولی ہونے پر اصرار ہے۔ اردو اور فارسی دونوں دواوین میں یہ دعوی موجود ہے۔ میں
غالب کی ولایت کا قائل نہیں ہوں، اس لئے اور کہ آپ بھی میرے ہمنوا ہیں۔ والی حکمت سخن وہ یقیناً ہیں اور اس مملکت میں انہوں نے فرماں روا
ہوش و خرد کے ساتھ کی ہے۔ غالب سے پہلے اردو غزل یا تو روایتی تھی یا میر جیسے اچھے اور سچے شاعروں کے یہاں "جراحتوں کا چمن" تھی
غالب نے پہلی بار اسے فکر کا انداز اور لہجہ بخشا یہی ندرت غالب ہے اور اسی میں غالب کی عظمت پوشیدہ ہے۔ شعر غالب کی شخصیت کا اظہ
ہے ان کی شخصیت پیچ در پیچ تھی، اس لئے ان کے اشعار پہلو دار ہیں۔

فنون لطیفہ میں فن کوئی بند ھا ٹکا ٹیکنیکل یا میکانیکی عمل نہیں ہوتا۔ ہر فنکار اپنا عمل ساتھ لاتا ہے۔ غالب ایک چابک دست فنکار ہیں

وہ شعر نہ تو رعایتِ لفظی کی خاطر کہتے ہیں نہ صنعت گری اور بازیگری دکھاتے ہیں۔ لیکن بات کہنے اور سامع کے دل میں اتارنے کا ڈھب ان کو خوب آتا ہے۔ وہ علم بلاغت کے تمام تصنع و ترصیع کو موقع محل کے لحاظ سے بروئے کار لاتے ہیں۔ انہوں نے ایسی صنعتیں استعمال کی ہیں جن کا کتب بلاغت میں کوئی نام نہیں۔ جیسے بتوں کے عشوے جن کو کوئی نام نہیں دیا جا سکا ہے۔ اسی سبب سے ان کا ہر لفظ "گنجینۂ معنی کا طلسم" ہوتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ ابہام کے کتنے اقسام ہیں۔ کب شعر کے لئے یہ زلف گرہ گیر کا حکم رکھتا ہے اور کب زنجیرِ پا بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں:

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

لفظوں کے استعمال کا جیسا غیر معمولی شعور غالب کو ہے اردو کے بہت کم شعرا کو ہے۔ ایک طرف ان کو فارسی فرہنگ و آہنگ پر عبور، دوسری طرف دلّی کے روزمرہ اور محاورے پر دسترس۔ اس طرح وہ ایک نئے انداز سے بساطِ شعر آراستہ کرتے ہیں۔ روزمرہ کے واقعات سے اپنے اشعار میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تمہیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو — کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو
کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی" — بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں کیوں ہو"
نکتہ چیں ہے غمِ دل اسکو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

یہ اشعار اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ غالب کو دلّی کے روزمرہ پر کتنا غیر معمولی عبور تھا۔ لیکن غالب کی اردو نہ تو قلعۂ معلّیٰ کے اکابر کی وہ شوخ و شنگ اردو تھی جس کا نمونہ داغ کی شاعری میں ملتا ہے نہ دلّی کے بازاروں اور گزرگاہوں کی اردو۔ غالب کی اردو خوش نوایان اور شرفائے دہلی کے ایوانوں اور محلسراؤں کی اردو تھی۔ آپ کے علم میں ہوگا، غالب نے اپنے ایک خط میں لفظ "تئیں" پر جسے دہلی والے اس وقت بھی بولتے تھے اور آج بھی ان کی زبانوں پر رواں ہے، کس برہمی و بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس لفظ کو نہ صرف متروک بلکہ مردہ قرار دیتے ہیں۔ غالب نے اردو خطوط نہ لکھے ہوتے تب بھی ان کے اردو کلام میں روزمرہ اور محاورے پر جو قدرت ملتی ہے صرف اس سے ان کی غیر معمولی قدرتِ بیان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے — وہ بھی گر چاہیں تو پھر کیا چاہئے

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی — جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت — پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

ان اشعار میں دہلی کا بھرپور لہجہ ملتا ہے۔ ایسی سادگی جس میں پرکاری بھی ہے، ایسی پرکاری جو الفاظ سے نہیں بلکہ لہجے کے اتار چڑھاؤ سے برآمد ہوتی ہے۔ روزمرہ اور محاورے سے کھیلنا اور کھلانا اردو شعراء کا ہمیشہ سے بڑا محبوب مشغلہ رہا ہے جیسے روزمرہ اور محاورہ ہی شاعری کا مقصد اور زبان دانی کا معیار رہ گیا ہو۔ غالب نے روزمرہ کو کلیتہً اپنا دست نگر رکھا ہے، اس کے دست نگر کہیں بھی نہیں ہوئے۔

حالی نے غالب کی فارسی نظم و نثر پر حکم لگاتے ہوئے لکھا ہے کہ امیر خسرو کے بعد اس باب میں ایسا صاحب کمال سرزمین ہند سے اٹھا ہے نہ اٹھے گا۔ فارسی کے بعض مبصرین کا خیال ہے کہ غالب کے فارسی مکاتیب کے تبصرہ و تحسین پر اب تک خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ میری ماہرانہ ہرگز نہیں لیکن نیازمندانہ رائے ہے کہ فارسی میں غالب کا اصلی کمال ان کی مثنویات اور قصائد میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی فارسی غزلیں اپنے تنوع اور شاعرانہ ابلاغ کی وجہ سے ظہوری کی غزلوں سے یقیناً زیادہ کامیاب ہیں۔ اس اعتبار سے ظہوری خفائی اور غالب ظہوری ہیں۔ تاہم وہ اب تک اہل زبان کی نظر میں کچھ زیادہ وزن و وقعت نہیں حاصل کر سکے ہیں۔ غالب مبدا فیاض سے فارسی زبان میں چاہے جس قدر دستگاہ یا آتشکدۂ ایران سے شعلہ و شرر لائے ہوں، تھے وہ عبداللہ کے بیٹے اور کمیدان غلام حسین کے نواسے۔ بچپن خود ان کے بیان کے مطابق لہو و لعب میں گزرا۔ ایسی صورت میں فارسی غالب کی اکتسابی زبان ٹھہری اکتسابی زبان میں لکھنے والا، اہل زبان کی نظر میں کچھ زیادہ وقیع نہیں ہوتا۔ شاعری، زبان کا بڑا ہی لطیف اور ماہرانہ عمل ہے۔ اس میں ہر لفظ کے معنی، معنویت اور محل و موقع کا بڑا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سبک ہندی کے پیرو تاریخ ادبیات ایران میں اب تک کوئی قابلِ لحاظ مقام حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا پڑیگا کہ یہ غالب کا "بے رنگ مجموعۂ اردو" ہی ہے جس کی بنیاد پر ان کے شعر کی شہرت گیتی میں قائم ہے۔ کیا معلوم اپنے آخری دور میں انھوں نے یہ محسوس بھی کیا ہو جب ہی تو کہتے ہیں:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکے ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غالب دولسانی (اردو اور فارسی) کے شاعر تھے۔ ابتدائی کلام زیادہ تر اردو کا ہے۔ دوسرے دور سے فارسی شاعری پر خاص توجہ رہی ہے۔ دولسانی شاعر ہونے کی حیثیت سے اس بات کا امکان تھا کہ ان کی دونوں زبانوں کی شاعری میں مماثل اشعار کثرت سے ملتے۔ تعجب ہے کہ ایسا نہیں ہے سوا گنے چنے چند اشعار کے جو پیش کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کی دلچسپی کا باعث ہوں:

(۱)

اندراں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گذشت
کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

(۲) ہائے این پنجہ کہ باجیب کشاکش دارد
بود با دامن پاکت چہ قدر ہا گستاخ
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی جاناں کے دامن کو کبھی میرے گریباں کو

(۳) گُلے بر گوشۂ دستار داری
خوشا بخت بلند باغ باناں
ترے جواہر طرف کُلَہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

یا

گوہر کو عقد گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

(۴) دیگر ز سازِ بے خودیٔ ما صدا مجوئے
آوازے از گسستنِ تار خودیم ما
نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

(۵) شکستہ رنگِ تو از عشق خوش تماشائیست
بہارِ دہر بہ رنگینیٔ خزانِ تو نیست
ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

(۶) لالہ و گل دمد از طرف مزارش پس مرگ
تا چہا در دلِ غالب ہوس روئے تو بود
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

لیکن ایسے اتفاقات کم ہیں، ورنہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دو غالب تھے۔ ایرانی نژاد اور ہندی نہاد۔ لسانی اور معنوی اعتبار سے اُن کی فارسی میں کلاسیکی توانائی اور طنطنہ ملتا ہے۔ لہجہ عام طور پر فکری ہے۔ استوار و ہموار۔ فارسی شاعری میں بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کرتے۔ اردو میں اتنی احتیاط ملحوظ رکھنا شاید ضروری نہیں سمجھتے۔ اردو کلام میں وہ جتنے بے تکلف نظر آتے ہیں، اتنے ہی فارسی میں باادب ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مادری زبان اور اکتسابی زبان میں کیا فرق ہے۔ اس لئے غالب کے فارسی کلام میں چاشنی نہیں ملتی، اس کے برعکس اردو میں روزمرہ کی لذت اور طنز و مزاح کا بانکپن ہے۔ فارسی کے اہل زبان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ غالب کے ہاں جابجا روزمرہ سے انحراف بھی ملتا ہے۔ غالب کتنا ہی کہتے رہیں:

بود غالب عندلیبے از گلستانِ عجم
من ز غفلت طوطیٔ ہندوستاں نامیدمش

ہیں وہ طوطیٔ ہندوستان ہی۔

اپنے عصر کے جمالیاتی فکر کے مطابق غالب بھی شعر کا الہامی تصور رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاعرانہ مضامین غیب سے خیال میں آتے ہیں لیکن اس بنیادی تصور کے ساتھ ساتھ ان کو ہیئت کا پورا شعور تھا۔ اپنے خطوط میں انھوں نے لفظوں کے تعینِ مفہوم سے بار بار بحث کی ہے اور نئے نئے نکتے پیدا کیے ہیں۔ ہرچند وہ صحیح معنوں میں لغت نویس نہیں تھے اور برہان قاطع کے سلسلے کی بحث میں پڑ کر اپنی عزت و شہرت کو خطرے میں ڈالا، تاہم لغت شعر پر ان کی بڑی اچھی نظر تھی۔ لفظ کی اس اہمیت کے باوجود غالب کی جمالیاتی فکر "ماورائے لفظ" کی قائل تھی۔ معنی، ان کے نزدیک پیکر لطافت تھے اور لفظ پیکر تحریر۔ اس لئے اکثر معنی پیکرِ تحریر میں نہیں ڈھالے جا سکتے ہیں۔ کہتے ہیں:

سخنِ ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر
نہ شود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

ان کا یہ خیال صحیح ہے کہ شعر اپنی انتہائی لطافت میں ذوقیات سے تعلق رکھتا ہے، تشریحات سے نہیں۔ مولوی کرامت علی کو ایک شعر کے بارے میں لکھتے ہیں "اس شعر کا لطف وجدانی ہے بیانی نہیں"۔ لفظ و معنی کے اس باہمی ربط کو پیش نظر رکھتے ہوئے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں "بھائی شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں"۔

غالب فنِ شعر کی ترقی کے لئے سازگار ماحول ضروری سمجھتے تھے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں: "زیست بسر کرنے کے لئے کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہیں"۔ ان کی شاعری کے اصل محرکات "مضمون آفرینی" اور "ذوق نواسنجی" ہیں۔ بعض اوقات "رعنائی خیال" کا محور کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

رعنائیِ خیال کی تہ میں ایک مادّی شخصیت اور وجود کی موجودگی غالب کے تخلیقی عمل کو حالی کے اس قول کے تابع کر دیتی ہے کہ "ہر خیال کی تہ میں کسی مادّی بنیاد کا ہونا ضروری ہے۔" غالب کی جمالیات میں جذبے پر ہر خیال کو فوقیت حاصل ہے۔ لفظ خیال سے مرکب تراکیب کا غالب نے کثرت سے استعمال کیا ہے، یہی قوت متخیلہ غالب کو مضمون اور معنی آفرینی کی جانب کھینچتی ہے۔ اس کی ترجمانی "مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال" میں ملتی ہے۔

غالب کو اپنی فارسی دانی پر بڑا ناز تھا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں: "فارسی میں مبدار فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے خمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔" مفتی میر عباس کو لکھتے ہیں "فارسی کے ساتھ ایک مناسب ازلی و سرمدی لایا ہوں۔" غالب غلط العام کے قائل نہ تھے۔ کہتے ہیں: "اپنا ذوقِ فارسی اور مسلک خلافِ جمہور۔" اردو غزل میں عجم کا حسن طبیعت غالب کا عطیہ ہے۔ لیکن اس ذوقِ فارسی کے ساتھ ساتھ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا ہے، غالب کا لسانی ماحول خالص مرزائی دہلی کا تھا جہاں قلعۂ معلّٰی کا محاورہ رائج تھا یہی وجہ ہے کہ غالب نہایت شستہ اردو میں مکتوب نگاری کر سکے۔ اردو شاعری کو اپنی فارسی دانی کے اثر سے نہ بچا سکے۔ لیکن رقعات میں فارسی انشا کا مطلق اثر نہیں ملتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مبدأ فیاض سے فارسی دستگاہ ملی ہو یا نہیں، اردو قواعد و ضوابط ان کے خمیر میں اس طرح پیوست تھے جیسے فولاد میں جوہر۔ اردو میں انھوں نے نہ صرف غلط العوام بلکہ غلط العام سے بھی پرہیز کیا۔

غالب نے اپنے بدیسی یا ولایتی (سلجوق ترک) ہونے کا امتیاز اور اپنی ناقدری کے احساس کا اظہار بار بار اور طرح طرح سے کیا ہے۔ یہ موضوع ایک حد تک ان کے کلام اور لب و لہجے کی پہچان بن گیا ہے، ان کا حسن بھی۔ سوال یہ ہے کہ اگر غالب ہندوستان کے بجائے اپنے اسلاف کے دیار میں پیدا ہوئے ہوتے اور ہندوستان سے اتنے ہی دور اور بیگانہ ہوتے جتنے کہ تین چار پشت پہلے ان کے قبیلے کے بزرگ تھے تو غالب وہی غالب ہو سکتے یا نہیں، جو ڈیڑھ سو سال سے ہمارے سامنے ہیں اور آج تمام مہذب ممالک میں ان کی شاعری اور شخصیت پر اہل فکر و نظر عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کے فارسی کلام کے بارے میں اس سے پہلے گفتگو آچکی ہے۔ عجم جس سے نسبت رکھنے پر ان کو اتنا اصرار ہے، ان کی فارسی اور فارسی کلام کو وہ درجہ نہیں دیتا جس کا دعویٰ یا ارمان غالب کو رہا۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ یہ اعرابی (غالب) ہندوستان آکر کعبہ تک پہنچ سکا ورنہ ترکستان یا ترکستان کے راستے ہی میں کہیں رہ جاتا۔ غالب کی جینیس کو اگر اردو اپنے تمام حسن و ہنر کے ساتھ نہ ملی ہوتی اور مغل تہذیب کا عظیم ورثہ، اردو شعر و ادب کی آزمودہ روایات اور اس کا مخصوص تار و پود، نیز دہلی کا سخت گیر شائستہ سماج نصیب نہ ہوا ہوتا تو غالب اردو شاعری اور مکتوب نگاری میں "شہرت عام اور بقائے دوام" کا درجہ حاصل نہ کر سکتے۔ اس طور پر غالب کا اردو شاعری پر جتنا احسان ہے۔ اس سے کچھ کم احسان اردو شعر و ادب کا غالب پر نہیں ہے۔ بات چھڑ جاتی ہے تو سلاسل ردِ عمل CHAIN REACTION) کی زد میں اگر قیامت یا کسی کی جوانی تک ضرور پہنچتی ہے۔ چنانچہ غالب کے بارے میں اگر اردو اور دہلی ایک کثر عجمی (فردوسی) کی گفتار کو دہرا دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یعنی غالب کو ہم نے رستم داستان بنا دیا ورنہ وہ سیستان کے ایک معمولی

پہلوان تھے اردو میں رہ جاتے۔

فردوسی نے شاہ نامہ لکھ کر کہا تھا "عجم زندہ کردم بدیں پارسی" اسی اعتماد و افتخار سے غالب کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اردو کلام سے فارسی کو ہندوستان میں زندگیِ نو بخشی، اس ہندوستان و ایران کی تاریخی و تہذیبی یک جہتی کو محکم تر اور مقبول تر کردیا۔ غالب نے شاہ نامہ تو نہیں تصنیف کیا لیکن اردو میں فردوسی کے ظہور کے امکانات پیدا کردیئے۔ اس طور پر یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، فارسی کی بڑی معتبر سفیر اردو ہے۔ فارسی ہی کی نہیں، اپنے ملک کی زبانوں کی بھی!

ایک بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ ہندوستان اور ایران کی کلاسیکی مثنویوں کا علم رکھتے ہوئے غالب کوئی بلند پایہ مثنوی فارسی یا اردو کو کیوں نہ دے سکے۔ فردوسی، نظامی، خسرو، جامی کی روایات ان کے سامنے تھیں۔ ایسی مثنوی کے لئے جس قدرتِ شعری اور قوتِ متخیلہ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی غالب میں بیش از بیش تھی۔ البتہ عقیدہ و عمل کی اس تپش و توانائی کی کمی تھی جو بالعموم مذہب اور ماورائیت کی دین ہوتی ہے اور جس کے بغیر بڑے کام انجام نہیں پاتے۔ غالب میں عصبیت تھی، عینیت (آئیڈلزم) نہ تھی۔ کبھی کبھی اغراض کو اقدار پر ترجیح دیجائے۔ انہوں نے فارسی میں متعدد مختصر مثنویات تصنیف کی ہیں جو اپنی جگہ پر خوب اور بہت خوب ہیں ان میں سے ایک بیان معراج میں بھی ہے۔ اس میں جہاں تہاں مولود شریف کا انداز آگیا ہے اور یہی وہ چیز تھی جس کی غالب سے کم سے کم توقع کی جاتی تھی۔ معراج پر لکھنے کا غالب کو حوصلہ بھی تھا اور صلاحیت بھی۔ لیکن جن مکروہات و مصائب میں وہ مبتلا ہو گئے تھے ان سے نجات پا سکے نہ ان سے عہدہ برآ ہو سکے۔ معراج دراصل مجاہد، مفکر اور صاحبِ یقین کا موضوع ہے جب تک شاعر یا فنکار میں یہ تینوں صلاحیتیں موجود اور برسرِ عمل نہ ہوں گی "اس موضوع پر کوئی بڑی نظم (مثنوی) نہیں لکھی جاسکتی۔ مذہب و ماورائیت سے قطع نظر غالب اگر "انحرافِ عظیم" یا "انکارِ ابلیس" پر کوئی مثنوی تصنیف کر سکتے تو یقیناً ان کی غزلوں سے وہ کم مقبول نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ اردو مثنوی کی قدر و قیمت میں جو گراں بہا اضافہ ہوتا اس کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

مگر غالب بھی کیا کرتے۔ قدیم مثنویوں کی رزم اور بزم کی داستانوں کے لیے جس طرح کی اساطیری فضا، مافوق الفطرت کردار، اور ان کے محیّرالعقول کارنامے سازگار ہوتے تھے، اب ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہ گئی۔ انسان نے خارج پر اتنی قدرت حاصل کرلی ہے کہ تخیل کی عجوبہ تراشی کا کیا ذکر، ماہ و مریخ کی تسخیر میں بھی اب کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے۔ پہلے تخیل کی مدد سے جہاں پہنچتے تھے، اب وہاں سے بھی آگے مشین [illegible] پہنچ جاتے ہیں۔ کبھی تخیل کی پیرو مشین تھی اب مشین کی گرد راہ تخیل ہے۔ بااینہمہ مذہب و ماورائیت کی وسعتوں میں انسان کی رفعت و رفاہ کے ایسے سرچشمے ملتے ہیں جن سے شاعری و شخصیت ہمیشہ شاداب و تازہ کار رہے گی۔ خارج ہمیشہ تسخیر ہوتا رہے گا۔ باطن ہمیشہ تجسس کا محرک اور تسکین کا موجب رہیگا۔ "آنکہ یافت نشود آنم آرزوست" میں بھی رمز اور بشارت پوشیدہ ہے۔

کسی شاعر اور اس کی شاعری کے حسن اور افادے کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ ہر طرح کے لوگ ہر طرح کے موقعوں پر کس بے ساختگی اور کثرت سے اس کے اقوال کو معرضِ گفتار میں لاتے ہیں۔ ضرب الامثال اسی طرح بنتے ہیں اور پھر نہیں مٹتے۔ چنانچہ

بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ عام طور پر جتنے اشعار، مصرع، فقرے اور تراکیب اقبالؔ اور غالبؔ کے کلام سے ہماری تحریر و تقریر میں بے اختیار آتے ہیں، وہ کسی دوسرے اردو شاعر کے نہیں آتے۔ اقبالؔ و غالبؔ یا غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد میرؔ ہیں اس کے بعد پھر دیکھیں کس شاعر کے اشعار یا مصرع ضرب الامثال کے طور پر زباں پر رواں ہوتے ہیں، اس کا دار و مدار اس پر ہے کہ سوسائٹی پر کس طرح کے شاعر اور شاعری کی گرفت ہے۔ ایک زمانے میں داغؔ اور امیرؔ اور ان کے قبیلے کے شاعروں کے کلام سے سوسائٹی متاثر تھی، اس لئے ان کے اشعار اور مصرع زبان پر آتے تھے۔ اس کے بعد معاشرے کا مذاق بدلا۔ اور بلند ہوا تو غالبؔ اور اقبالؔ کو قبول عام نصیب ہوا۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اردو سماج پر ان کی گرفت بڑھتی رہے گی۔ اس لئے کہ بحیثیت مجموعی اردو شعر و ادب کا معیار کافی بلند ہو چکا ہے اور اس کے مزید بلند ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اردو میں غالبؔ اور اقبالؔ سے بڑا شاعر کب پیدا ہوتا ہے مستقبل قریب میں تو نظر نہیں آتا۔

کسی شاعر کے شعر، مصرع یا فقرے کا ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لینا اس کے معاشرے کے ہر چھوٹے بڑے کی طرف سے اس کے لئے بڑی گرانقدر تحسین ہے جس کا حاصل کر لینا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ غالبؔ کو ایک مخصوص و ممتاز بالشان امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ ارباب فن و فکر نے اپنے کلام، تصانیف یا تالیفات کے لئے اپنی پسند کے جتنے نام غالبؔ کے کلام سے چنے ہیں کسی اور کے کلام سے نہیں۔ یہ نام کلیتہً غالبؔ کے اردو کلام سے لئے گئے ہیں لیکن ترکیب، آہنگ اور فرہنگ کے لحاظ سے تمام تر فارسی ہیں۔ حالانکہ اردو میں فارسی کی غیر معمولی آمیزش کے لئے غالبؔ خاص طور پر بدنام ہیں۔ در اصل غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ نے ہمارے ذوق اور ذہن کو اردو شاعری سے ایک نئی وابستگی اور اس کا ایک نیا انشراح بخشا۔ ان سے ہم کو ایک نیا عہد نامہ ملا ہے۔ اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ہماری شاعری کا معیار برا اونچا ہوتا رہے گا، پست کبھی نہ ہوگا۔ شاعری ہی کا نہیں ہماری رزم و بزم کا بھی۔ اس معیار و میزان کے پیش نظر جب ہم ان شاعروں اور ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں جنھوں نے گذشتہ ۳۰۔۴۰ سال سے شاعری کے تصور اور شعر کی ہیئت اور مطالب کے اظہار و ابلاغ کے نئے راستے اور نئے وسیلے پیش کئے ہیں اور کرتے رہے ہیں تو معلوم ہوگا کہ ضرورت کے وقت ان کا کلام ہماری مدد نہیں کرتا، نہ لکھنے میں نہ بولنے میں، نہ سوچنے میں، نہ یاد رکھنے میں نہ یاد آنے میں۔ پڑھیئے تو فوتِ فرصتِ ہستی کا غم دامنگیر ہو جاتا ہے۔ اس کمی کی کہیں اور کوئی اہمیت ہو یا نہیں، اردو سماج اور شعر و ادب میں اب تک یہ بہت بڑی کمی سمجھی گئی ہے۔ کسی شاعر کے صحت مند، تخیل افروز اور فکر انگیز ہونے کی ایک شناخت یہ ہے کہ اس میں کم سے کم شاعر ہوں اور ان کا کلام پسند کرنے والوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہو، نہ کہ اس کے برعکس۔

خدا، عورت اور شراب اُن چند موضوعات میں سے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے میں اچھے شاعر کو بڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ایسے پُل صراط ہیں جن پر سے عافیت و عزت سے گزر جانا آسان نہیں۔ پل صراط آخرت ہی کا نہیں، اس دنیا کا بھی مسئلہ ہے، شاید اہم تر اور نازک تر۔ اپنے اپنے منصب اور مسائل کے اعتبار سے ہر شخص ہر لحظہ اس سے گزرتا اور انعام یا عبرت سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ ان موضوعات پر کسی شاعر کے دو چار شعر بھی سن لوں تو، ثواب یا گناہ سے قطع نظر، یہ بتا سکوں گا کہ اپنے ذوق، ظرف اور ذہن کے اعتبار سے وہ کس پائے کا شاعر ہے۔ ہمارے شاعروں کا دیرینہ رشتہ خدا سے مناجاتی یا سائلانہ رہا ہے اور موجودہ دور میں

استہزائی یا حفظِ مراتب سے بیگانگی کا۔ عورت سے سستی تفریح و تعیش اکثر تفنن کا۔ نوجوان شعرا یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ خدا سے انحراف یا انکار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ عورت، ادب، معاشرے، اخلاق اور اقدار سب کے تقاضوں کو اپنے نفس کے تقاضوں پر قربان کر دیں۔

خدا اور انسان کا رشتہ خالق و مخلوق کا یقیناً ہے۔ بعضوں کے نزدیک آقا اور غلام کا ہو تو اس سے بحث نہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اور ان سے علیحدہ ایک رشتہ اور ہے یعنی انسان کا اس دنیا میں اللہ کے نائب ہونے کا۔ ایسا نائب جو اقتدارِ اعلیٰ کے جبر و قہر کا اتنا نہیں جتنا اس کی عظمت، حکمت اور رحمت کا نمائندہ اور نمونہ ہے۔ وہ خدا کی دی ہوئی استعداد یا اختیار کی بنا پر اس کے حضور میں تقدیرِ انسان اور نظمِ جہان پر اپنے اثرات و ردِ عمل کا اظہار کرنے کا مجاز ہے۔ خدا کا منشا یہ نہ ہوتا تو اس نے انسان کو ان اعلیٰ صلاحیتوں سے سرفراز نہ کیا ہوتا جو صرف اسی میں پائی جاتی ہیں۔ غالبؔ کے ہاں پہلی بار خدا کا تصور اپنے پیش رووں سے ہٹا ہوا ملتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے جو خدا کے نائب یا نمائندے کا ہونا چاہیے۔ وہ خدا کی عظمت، حکمت و رحمت کا اتنا لحاظ یا احترام نہیں کرتے، جتنا اپنی ذاتی حسرتوں اور محرومیوں کا ماتم کرتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر ان کے یہاں اکثر وہ سطح اور لب و لہجہ نہیں ملتا جو اس طرح کے کلام میں لازم آتا ہے۔ غالبؔ جبر پر طعن کرتے ہیں، اختیار کا حق ادا نہیں کرتے۔ بڑا شاعر جبر کو اختیار قرار دے کر چیلنج دیتا بھی ہے، قبول بھی کرتا ہے۔ یہ بات ہم کو اقبالؔ کے یہاں ملتی ہے۔

غالبؔ کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں مَیں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

ہے غنیمت کہ بامّید گزر جائے گی عمر
نہ ملی داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

نغزی و خود پسند، بہ بینم چہا ہی کنی
یارب بہ دہر، ہمچو توئی آفریدہ باد

اردو شاعری پر غالبؔ کے جو احسانات ہیں ان سے قطعِ نظر، ان کی غیر معمولی شخصیت اور شاعری کا یوں بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے شراب کو اردو شاعری میں وہ درجہ دیا جو ہمارے شعرا اب تک نہ دے سکے تھے۔ شراب کا تصور پی کر بہک جانے میں تھا، اکثر بے پیے بہکنے کا، بد اطوار ہونے اور بے آبرو کرنے کا بھی۔ بعضوں نے شراب کی تطہیر تصوف سے کرنی چاہی یا تصوف کی گفتگو میں بادہ و ساغر کا جواز پیش کیا، لیکن یہ دونوں کسی سطح پر ایک دوسرے سے سازگار نہ ہو سکے۔ تضاد میں توافق پیدا کرنے کی کوشش یوں بھی نہ خوش نیتی ہے نہ عقلمندی۔ تعجب نہیں حشر میں شراب خدا سے شکایت کرے کہ اس کو قبل از وقت لوگوں میں کیوں اتار گیا جن کو نہ

مناسب ظرف نصیب ہوا تھا نہ ذوق. شراب پر کم شعر و ادب میں ایسے بے مثل اشعار ملیں گے، جیسے غالب نے کہے ہیں. اس پایے اور اس انداز کے اشعار نہ غالب کے فارسی کلام میں ملتے ہیں نہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں دیکھنے میں آئیں گے. یہ اشعار صرف غالب کہہ سکتے تھے، اردو میں کہہ سکتے تھے اور دہلی میں کہہ سکتے تھے جو اس عہد میں غالب اور اردو کا مجموعہ تھی. ملاحظہ ہوں:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ہے دورِ قدح، وجہ پریشانیٔ صہبا　　یک بار لگا دو خم مے میرے لبوں سے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ　　ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے

غالب کے ہاں خدا، شراب اور وہ خود ہیں، عورت نہیں. اقبال کے یہاں ایک اور چیز بھی ہے، یعنی تصورِ ابلیس، جس کا ذکر یا عمل دخل ہماری شاعری میں رسمی اور روایتی رہا ہے یعنی مسلسل اور آنکھ بند کر کے اس پر لعنت بھیجتے رہنا. اقبال نے شیطان کو قابلِ لعنت نہیں، قابلِ لحاظ بتایا. اردو شاعری میں اقبال پہلے شاعر ہیں جس نے انسان اور شیطان کو اس زاویے اور سطح سے پیش کیا جو مصالحِ خداوندی اور عظمتِ انسان سے قریب و قرین تھا. اقبال نے خدا، عورت، انسان اور شیطان کو اردو شاعری سے جس طرح متعارف کیا، اس سے ہمارے ادب، ہماری زندگی اور ہمارے سوچنے اور محسوس کرنے میں بڑا گرانقدر انقلاب آیا. اس دنیا میں خدا کی نیابت جس طرح انسان نے کی ہے یا اس کو کرنا چاہیے تھا اور جو اصل منشاءِ الہٰی اور تخلیقِ آدم تھا، نیز انسان کی وکالت خدا کے حضور میں جس شایانِ شان طریقے اور لب و لہجے سے اقبال نے کی وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے جس میں اقبال کا مثل شاید ہی کسی اور شعر و ادب میں نظر آئے. اس طرح اقبال نے انسان کی فکر و نظر کو ایک نئی وسعت اور اردو شعر و ادب کو ایک نئی وقعت، ذمہ داری اور روایت بخشی. اردو شاعری میں اقبال کے کلام نے وہ کیا جو کسی امت میں صحیفۂ آسمانی کے نزول سے دیکھنے میں آیا ہے. ان کا کلام اردو شاعری کے معیار کو کبھی گرنے نہ دے گا. اردو شاعری میں چاہے جتنے انقلاب آئیں، معیار وہی طلب کیا جائے گا جو اقبال کے کلام نے قائم کر دیا ہے. میں سمجھتا ہوں کہ عورت کا تصور حالی اور اقبال نے عفت، عزت اور عظمت کی جس سطح سے پیش کیا ہے وہ کسی دوسرے اردو یا فارسی شاعر کے

حصے میں نہیں آیا۔ غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کے بارے میں جو باتیں عرض کی گئی ہیں ان کو ذہن میں رکھ کر آج کل کی اردو شاعری اور ادب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے نئے شعراء، ادیب اور فنکار ہمارے شعر و ادب کو کہاں سے کہاں لئے جا رہے ہیں اور انھوں نے نئے ذہن کی کیسی رہبری یا قیادت کی ہے۔

غالبؔ کے کلام کا مطالعہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھ کر کرنا چاہیے کہ ہر پیغمبر جو کسی قوم میں بھیجا جاتا ہے، وہ اپنے سے پہلے کی شریعت کا بڑی حد تک ناسخ ہوتا ہے اور آئندہ شریعت کا بانی یا بشارت دینے والا۔ شعر و ادب میں یہ کارنامے غالبؔ کی طرح صرف منتخب اور عالی مقام شعرا نے انجام دیئے ہیں۔ غالبؔ نے اردو شاعری کو ایک نیا نسب ہی نہیں دیا بلکہ اس کو ایک نئی شریعت کی بشارت بھی دی۔ غالبؔ کے کلام کا غور سے مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ شاعری کی پچھلی شریعت بڑی حد تک منسوخ کیجا چکی ہے اور اقبالؔ کی آمد کی "اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی"۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

با من میاویز اے پدر، فرزندِ آذر را نگر
آں کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

آئینِ برہمن بہ نہایت رسانده ایم — غالبؔ بیا کہ شیوۂ آذر کنیم طرح
فرزند زیرِ تیغ پدری نہد گلو — گر خود پدر بآتش نمرود می رود

ز آفرینشِ عالم غرض جز آدم نیست
بگردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است

زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را — قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد
زخونے کہ در کربلا شد سبیل — ادا کرد وامِ زمانِ خلیل
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ اللعالمینے ہم بود

آں راز کہ در سینۂ نہاں است نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

ماضی کا لحاظ رکھنے میں غالبؔ اور اقبالؔ کا لہجہ کتنا ملتا جلتا ہے:

ہر زہ مشتاب و پے جادہ شناساں بردار — اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت
نقشِ پائے رفتگاں جادہ بود در جہاں — ہر کہ رود بایدش پاسِ قدم داشتن

غالبؔ اردو شاعری کی تنہا آواز ہیں۔ اس اعتبار سے کوئی ان کا شریک غالب نہیں۔ ان کے فن میں اردو تاریخ شعر کے سب دھارے یعنی جذبات نگاری، خیال آرائی اور صنعت گری یک جا ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایک نئے دھارے کا آغاز ہوتا ہے اور وہ ہے غزل کا فکری انداز جس میں ان کے شاعرانہ ذہن، جذبۂ خیال اور فکر کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے کلام کے

بارے میں کتنے پتے کی بات کس سادگی اور بے ساختگی سے کہدی ہے۔اس سادگی اور بے ساختگی سے جیسے یہ شعر کسی شاعری کے پرکھنے کا فارمولا بن گیا ہو۔ یعنی:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کوئی بھی ہو، کیسا ہی ہو، کہیں ہو، غالب کو ہر حال میں اپنا ترجمان اور غمگسار پائے گا۔ کتنے شاعر ایسے ہیں جو اتنے بے شمار مختلف الاحوال انسانوں کی ترجمانی اور ہمدردی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

شراب اور غالب کے عیب و ہنر پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ کیا کیجیے دونوں ایسے ہی واقع ہوئے ہیں۔ اس موقع پر امریکن عوامی گیت کا ایک ٹکڑا یاد آرہا ہے جہاں ایک سیدھا سادا عاشق اپنے محبوب کے بارے میں کہتا ہے:

WITH ALL YOUR FAULTS I LOVE YOU STILL تیرے تمام عیبوں کے باوجود میں تجھے عزیز رکھتا ہوں۔

ہم آپ اتنے سیدھے سادے تو نہیں ہیں جتنا کہ یہ امریکی عاشق، لیکن اس گانے کی بازگشت غالب کے لیے اپنے دلوں میں پاتے ہیں۔

کل کی گفتگو حالی کے مرثیۂ غالب پر ختم ہوئی تھی، آج غالب کو فارسی کی ان کی ایک نہایت مختصر غزل میں مطالعہ ہی نہیں مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اتنے مختصر کینوس پر اتنے مشکل ٹکنک میں اپنا اتنا روشن اور رقصاں مرقع غالب ہی پیش کر سکتے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر فنونِ لطیفہ کے دوسرے اصناف پر برتری حاصل کر لیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غالب اپنی شخصیت اور اپنے کلام کے اظہار میں "لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ" ہی میں اپنے کو منتقل نہ کر چکے ہوں بلکہ ایک مایوس و مجہول معاشرے کو رنگ و رامش کی بشارت اور جد و جہد کی آزمائش سے دوچار ہونے کی دعوت دے رہے ہوں۔ اس غزل میں کہیں عورت، انقلاب، آگ، خون اور ظلم کی ہیئت کو معرضِ بحث میں نہیں لایا گیا ہے۔ لیکن یہ ان تمام نظموں پر بھاری ہے جن کے سیلِ بے اماں کی زد میں ہم ہیں۔ غزل یہ ہے:

اے ذوقِ نواسنجی، بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے بر بنگہِ ہوش آور

گر خود بجہد از سر از دیدہ فرو بارم
دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

ہاں ہمدمِ فرزانہ، دانی رہِ ویرانہ
شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش آور

شوراب ایں وادی تلخ ست اگر راوی
از شہر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور

دانم کہ زرے داری ہر جا گذرے داری
مے گر ندہد سلطاں، از بادہ فروش آور

گر مغ بہ کدو ریزد، بر کف نہ و در راہ شو
ور شہ بہ سبو بخشد، بردار و بدوش آور

ریحاں دمد از مینا، رامش چکد از قلقل
آں در رہِ چشم افگن، ایں از پئے گوش آور

گاہے بہ سبکدستی، از بادہ زخویشم بر
گاہے بہ سیہ مستی، از نغمہ بہ ہوش آور
غالب کہ بقایش باد ہمپائے تو گر ناید
بارے غزلے، فردے، زاں موینہ پوش آور

تحقیق یا تنقید چاہے جو کہے غالب کی آواز یہی ہے۔

ڈاکٹر بجنوری اور تدوینِ دیوانِ غالبؔ

ڈاکٹر احمد لاری

انجمن ترقی اردو نے ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۲ء میں دیوان غالب کا ایک نیا اڈیشن اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں غالب کے غیر متداول کلام کو بھی شامل کرنے کا خیال تھا۔ علاوہ ازیں ملک کے چند مشہور ادیبوں سے غالب کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھوا کر انجمن اس دیوان میں ایک علمی شان بھی پیدا کرنا چاہتی تھی۔ دیوان کی ترتیب وتدوین کا کام سید ہاشمی کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے ۱۹۱۵ء تک اس کا مبیضہ تیار کر لیا[1] متداول کلام کے علاوہ انھوں نے "شرح دیوان غالبؔ" مرتبہ حسرت موہانی، دیوان غالب کے قلمی نسخہ مملوکہ نواب احمد سعید خاں اور دوسرے ذرائع سے کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی حاصل کرکے داخل دیوان کیا۔ اس سے آگے کی داستان سید ہاشمی ہی کی زبان سے سنیئے۔

> "انجمن کی تجویز اس منزل میں تھی کہ نظامی پریس بداؤں سے دیوان غالب کا نسخہ چھپ کر شائع ہوا[2] صحت یا حسن طبع کے اعتبار سے ایسا نہ تھا کہ جیسا انجمن چھاپنا چاہتی تھی، لیکن مروّجہ نسخوں سے کہیں بہتر تھا۔ لہٰذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولۂ طبع کو سرد کر دیا اور اگر اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیاً منسیاً ہو جاتی۔ مگر ان مرحوم کو کلام غالب سے اس درجہ عقیدت تھی کہ بہت سی مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے اور انجمن نے بڑی خوشی سے یہ کام اس ڈکٹر) کے سپرد کر دیا[3]"

جیسا کہ سید ہاشمی کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی یورپ سے واپسی کے بعد دیوان غالب کی ترتیب نو کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا۔ ڈاکٹر بجنوری غالباً ۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء میں ہندوستان آئے بہر حال وہ

---

[1] سہ ماہی "اردو" اکتوبر ۱۹۳۲ء (تبصرہ بر "دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ)" از سید ہاشمی) ص ۷۰۲۔

[2] اس دیوان کے خاتمہ کی عبارت کے نیچے ۲۲ مارچ ۱۹۱۵ء درج ہے۔

[3] سہ ماہی اردو، اکتوبر ۱۹۳۲ء (محولہ بالا تبصرہ) ص ص ۷۰۳-۷۰۴۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں بھوپال میں مشیر تعلیمات (ایجوکیشنل اڈوائزر) کے عہدے پر فائز تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نواب حمید اللہ خاں کے (جو اس زمانے میں پرنس تھے)، لٹریری سکرٹری اور حمیدیہ لائبریری سپرنٹنڈنٹ بھی تھے[1] اسی زمانے میں ان کا شعیب قریشی کے نام ایک خط ملتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے دیوان غالب کی ترتیب نو کا کام شروع کر دیا۔ بد قسمتی سے اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ اس خط میں وہ لکھتے ہیں۔

"ڈیرسٹ شعیب!

اب آپ بھوپال آجائیے۔

۱۔ غالب کے خط کی مجھے ضرورت ہے۔ اگر آپ نے تیغ کے صفحوں کا فوٹو لے لیا ہے تو کافی ہے۔

۲۔ نواب احمد سعید خاں صاحب کے دیوان کے[2] حاشیہ پر جو غزلیں غالب کی دوسروں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں وہ کون کون سی ہیں (کذا) نوٹ کریجئے گا اور اگر متداول نسخے سے کہیں اختلاف ہو تو وہ اختلاف نوٹ کریجئے گا۔ چند اشعار اور ایک آدھ قطعہ غیر مطبوعہ" جن کا خط میں ذکر کیا ہے وہ کیا ہیں۔ ضرور لکھ لائیے گا۔ اور نسخہ کا حوالہ دینے کے لیے نسخے کے لکھنے کا سنہ، کاتب کا نام وغیرہ، اگر کوئی مہر کہیں ہے اس کا پتہ نشان، کسی شخص کے خط میں اضافی غزلیں اور چند اشعار ایک آدھ قطعہ غیر مطبوعہ تحریر ہیں (شاید نواب صاحب کو معلوم ہو) وغیرہ وغیرہ بھی یادداشت کے طور پر درج کریجئے گا۔

۳۔ واسوخت کے متعلق میں آپ کی رائے سے متفق ہوں اور ہاشمی کے اڈٹ کیے ہوئے دیوان سے (جو انھوں نے مجھ کو دیدیا ہے)، اس کو کاٹ دوں گا۔ ....

۴۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا۔ "تکیہ" والی غزل پوری لکھ کر بھیجتا ہوں۔ سید ہاشمی نے جو دیوان کا اپنا اڈٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے اس میں یہ غزل نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے۔ اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے۔ جہاں تک میں مرزا صاحب کے کلام اردو سے واقفیت رکھتا ہوں زمین آسمان ٹل جائیں۔ لیکن یہ ان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق سخت ضروری ہے۔ دوسرے نواب صاحب کی اس بارہ میں رائے کیا ہے۔

---

[1] اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، ص ۲۵۷۔
[2] یہ اضافہ راقم السطور نے کیا ہے۔

طائر دل جو قطعہ ہے وہ بھی مرزا کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بارہ میں بھی نواب صاحب سے
جو کچھ مطابق یا مخالف معلوم ہو سکے نوٹ کر لیجیے گا۔ [۵]

ڈاکٹر بجنوری کی اس تحقیق و تلاش کا کیا نتیجہ نکلا یہ بتانا تو مشکل ہے۔ بہر حال انھوں نے دیوان غالب کو از سر نو
ترتیب دیا۔ وہ بڑے خوش ذوق اور نفاست پسند واقع ہوئے تھے، اس لیے وہ اس دیوان کو بڑے اہتمام کے ساتھ
چھپوانا چاہتے تھے۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق کے نام ان کے دو خطوط ملتے ہیں، جن پر بالترتیب ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۶ء
اور ۲۷ جولائی ۱۹۱۸ء کی تاریخ درج ہے۔ ان خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو دیوان ترتیب دیا تھا
اس کی کتابت بھی ہو گئی تھی، مگر طباعت کے مراحل ابھی طے نہیں ہوئے تھے اور اس کے متعلق خط و کتابت کا سلسلہ جاری
تھا۔ ان خطوط کے متعلقہ اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

مولانا ہاشمی صاحب کی گفتگو سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ شاید آپ کا ارادہ ہے کہ دیوان غالب
کو لکھنؤ "الناظر" پریس میں ہی طبع کرایا جائے۔ گو مجھ کو اس بات کا باور نہیں ہوتا۔ لیکن اس خبر نے مجھ کو
نہایت مشوش کر دیا ہے اور میں نہایت مضطربانہ التجا کرتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہ فرمایئے گا ورنہ تمام
محنت برباد ہو جائے گی۔ جو دیوان لکھنؤ میں کتابت ہوا ہے نہایت عمدہ ہے۔ لیکن اگر اس کی
چھپائی کے لیے کسی نہایت اعلیٰ درجے کے کلوں کے پریس میں انتظام نہ کیا گیا تو کتنا ہی عمدہ کاغذ
لگایا جائے حرف پھیل جائیں گے، سطریں غیر متوازی ہو جائیں گی اور تمام صورت اور نقشہ
بگڑ جائے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ اول تو لکھنؤ کے خوش نویس کے لکھے ہوئے مسودہ (کاپی) کو فوٹو کرانے
کی کوشش کی جائے۔ یو۔ اے۔ کلکتہ کا کارخانہ دنیا کے عمدہ کارخانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں
صرف ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ لاگت بہت بڑھ جائے گی۔ بہر حال ایک اندازہ طلب کرنے میں
مضائقہ نہیں۔

اس کے بعد ایک پریس بمبئی میں ایک شخص ہائے نامی نے کھولا ہے جو لیتھو میں بہترین بتلایا
جاتا ہے۔ ہائے نے لیتھو کا فن یورپ میں تحصیل کیا ہے۔ اس کا پتہ لگا کر اس سے طبع کرایا جائے
جو دیوان غالب آپ طبع کرا رہے ہیں وہ ایک کتاب کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ایک یادگار کی حیثیت
رکھتا ہے۔

---

۵ یہ خط مجھے مولانا خیسر بہوری صاحب نے عنایت فرمایا، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ ہاشمی صاحب کا خیال غلط ہے اور میں خواہ مخواہ یہ لکھ رہا ہوں۔ لیکن دل نے نہ مانا اور جب تک لکھ نہ دیا دل کا دوسہ نہ دیا۔" لہ

(۲) دیوان غالب کی کاپیاں پہنچ گئیں۔ ایک نمونہ تیار ہو رہا ہے۔ جب تیار ہو جائے گا، روانہ ہو گا۔ علاوہ اس کے ترنگ پلیٹ فوٹو ٹائپ کرنے کے متعلق خط وکتابت کر رہا ہوں۔ کلکتہ کی ایک کمپنی تیار ہے اوروں کے جواب ابھی نہیں آئے۔ تخمینوں سے اطلاع دوں گا۔ اگر آپ پانچ ہزار تک صرف کرنے کو تیار ہوں تو ضرور بہترین فوٹو ترنگ پلیٹ ٹائپ بہترین جلد کے ساتھ بہترین کاغذ سمیت ممکن ہے

(۳) کاپی ممکن ہے کہ اور لکھوانی پڑے۔ فوٹو ٹائپ کے لیے یہ موزوں نہیں ہے۔

(۴) چند تصاویر متعلق مضامین دیوان وغیرہ کا بھی بندوبست کر رہا ہوں دہلی سے قیصر کی تصویر بھی منگوالی ہے۔" ٹہ

لیکن اسی دوران میں در وسط ۱۹۱۸ء میں مولانا عبدالسلام ندوی بھوپال آئے اور حمیدیہ لائبریری میں ان کی نگاہ غالب کے اس نادر قلمی دیوان پر پڑی جو "نسخۂ بھوپال" کے نام سے مشہور ہے اور جس کی بنیاد پر بعد میں نسخۂ حمیدیہ شائع ہوا۔ اس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی "معارف" کے شمارہ ستمبر ۱۹۱۸ء میں لکھتے ہیں!

"ہمارے دوست مولانا عبدالسلام صاحب ندوی شعرالہند کی خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے۔ وہاں کے کتب خانہ حمیدیہ میں انہیں ایک انمول جواہر ملا، یعنی مرزا غالب کا اصل مکمل اردو دیوان بلا حذف وانتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے۔ نہایت عمدہ مطلا نسخہ ہے۔ کسی خوش مذاق کے ہاتھ وہ پڑا تھا۔ اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی لکھ دیا ہے۔

یہ نسخہ اب جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مشیر تعلیمات بھوپال کے مطالعے میں ہے موصوف آج کل دیوان غالب کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں اور عنقریب ان کے نتائج فکر (انجمن، ترقی اردو کے ذریعے سے منظر عام پر آئیں گے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کیا ہے کہ اس نئے نسخہ پر تقریظ لکھ کر وہ ناظرین معارف کے لیے مرحمت فرمائیں۔" سہ

لہ "نقوش" لاہور، مکاتیب نمبر جلد دوم، ص ص ۸۰ - ۵۷۹

ٹہ "نقوش" لاہور، مکاتیب نمبر، جلد دوم ص۔ ۵۸۰

سہ معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۱۸ء، ص ۱۱۶

"نسخہ بھوپال" سے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک اور بیان بھی ملتا ہے۔ اس سے ڈاکٹر بجنوری کے مرتبہ دیوان غالب اور "نسخہ بھوپال" کی ترتیب و تدوین سے متعلق ان کے منصوبوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اسے بھی ملاحظہ کرتے چلیے۔ دیوان غالب مصححہ مولوی ابو البیان سید حامد حسین بلال شاہجہان پوری پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں۔

"مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری انجمن ترقی اردو کی طرف سے نہایت کوشش کے ساتھ اس کا (دیوان غالب کا) ایک صحیح اور عمدہ نسخہ تیار کر رہے تھے۔ مرحوم نے اس کے لیے بڑی محنت اٹھائی تھی۔ ایک دیباچہ لکھا تھا جس میں غالب کی شاعری اور فلسفہ پر عمدہ خیالات مرتب کیے تھے۔ اسی اثنا میں ہمارے دوست مولانا عبدالسلام ندوی کو بھوپال کے ایک رئیس کو "ہدیتہ" بھیجا تھا۔ مرحوم ڈاکٹر بجنوری کا ارادہ تھا، جیسا کہ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ وہ اس دیوان کا فوٹو بعینہٖ اپنے نسخہ کے اخیر میں شامل کریں گے۔

لیکن افسوس کہ ؎

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

امید تھی کہ ان کے احباب اور انجمن ترقی اردو مرحوم کی یادگار میں اس نسخہ کو چھاپ کر شائع کرے گی، لیکن مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن کی زبانی یہ سن کر افسوس ہوا کہ مرحوم کی یہ محنت و کاوش ریاستوں کی پولیٹیکل کشمکش میں ضائع ہونا چاہتی ہے۔"[۱]

نسخہ بھوپال کے ملتے ہی ڈاکٹر بجنوری اپنے مرتبہ دیوان سے بے نیاز ہو کر اس کی ترتیب و تدوین میں دل و جان سے مصروف ہو گئے۔ اس کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کو اطلاع دیتے ہوئے وہ ایک خط مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۱۸ء میں لکھتے ہیں!

"مخدومی معظمی سلامت۔ تسلیم بعد تعظیم

آپ کا والا نامہ عین انتظار میں شرف صدور لایا۔ جس دن سے وہ نسخہ دیوانِ غالب کا میرے پاس آیا ہے شہر کے علمی طبقہ میں ایک ہلچل بپا ہے۔ آدھا بھوپال میرے خلاف ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا ہوا مجھ کو ملا۔

مولوی سلیمان ندوی صاحب نے بھی ایک حملہ فرمایا تھا۔ لیکن میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلنا پڑے، خواہ جان جائے، اب نسخہ نہیں جاتا۔ انشاء اللہ۔ جتنا جھوٹ آج کل بول رہا ہوں عمر بھر موقع نہ ہوا تھا۔

---

[۱] "معارف" اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۱۹ء، ص ص ۳۱۵ - ۱۶

جب ہاشمی صاحب آویں گے اپنی مفصل تجویز پیش کروں گا۔ آپ ان کے ہمراہ جو تصاویر، آرائش کی چیزیں وغیرہ آپ نے جمع کی ہیں اور جو کچھ مصالحہ یا خط وکتابت وغیرہ ہے سب بھیج دیجئے گا شعیب میری ہدایات کے مطابق چند چیزوں کی فراہمی میں مشغول ہیں اور سراپا سعی ہو رہے ہیں۔

کاغذ کا مسئلہ سب سے ٹیڑھا ہے۔ آپ علیگڑھ لکھیے، اگر کلیات خسرو میں سے کاغذ بچا ہو سب کو انجمن کے لیے فوراً خرید لیجیے کسی طرح بیکار نہیں ہو سکتا۔ اگر بچ رہا یا خدانخواستہ کام میں نہ رہا تو بک سکتا ہے۔ اگر اخبارات میں اعلان ابھی نہ دیا ہو تو اس میں بھی چندے توقف کیجئے ہاشمی صاحب سے گفتگو کر دوں۔

دیوان اڈٹ کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ جب ہاشمی صاحب تشریف لائیں گے تو کافی نمونہ پیش کر سکوں گا۔ فرمایئے کتنے روپے تک انجمن خرچ کر سکتی ہے۔ کاش اس وقت کہیں سے کچھ ہاتھ لگتا۔ سیرۃ النبی کی پہلی جلد پر آٹھ ہزار روپیہ خرچ ہے، پانچ ہزار تو اس کام کے لیئے ہوتا" [۱]

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے سید ہاشمی کو بھوپال بھیجا اور انھوں نے وہاں جاکر نسخہ بھوپال کی زیارت کی۔ زیارت کی۔ اس واقعے کی تفصیل سید ہاشمی ہی کی زبان سے سنئے۔

" اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمن کو نہایت خوشی ہوئی، اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے خاکسار نے بھوپال جاکر اس قلمی نسخے کی زیارت کی جو ۱۲۳۶ھ میں درجب کہ غالب کی عمر صرف ۲۵ برس کی تھی) تحریر کیا گیا تھا۔ لوح اور خاتمہ کتاب کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا غالب مرحوم ہی کا کلام ہے اور چونکہ بالکل ابتدائی زمانے میں نقل کرایا گیا تھا۔ لہذا گو بعد کی غزلیں اس نسخے میں نہیں درج ہوئیں تاہم وہ ابتدائی کلام تمام وکمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا صاحب نے دیوان چھپواتے وقت خارج اور تلف کر دیا تھا۔

ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جو بجلسے مرزا صاحب نے تو خارج کر دیے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں ان کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا کہ دیکھنے والے کو بلا دقت قدیم وجدید کا فرق اور بعد کی اصلاح وتنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔

---

[۱] یہ خط بھی مجھے مولانا خیر بھوروی صاحب نے مرحمت فرمایا۔

یہ بھی امید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے۔ لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہوا تھا کہ ان کا تپ دیائی میں انتقال ہوگیا اور وہ سب امیدیں جو مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں خاک میں مل گئیں ''۔[1]

ڈاکٹر بجنوری نے ۷ر نومبر ۱۹۱۸ء کو وفات پائی۔ گویا وہ ''نسخۂ بھوپال'' کے ملنے کے بعد تقریباً تین ماہ حیات رہے۔ اس دوران میں انھوں نے ''نسخہ بھوپال'' کی ترتیب و تدوین کے مختلف منصوبے بنائے۔ جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور سید ہاشمی کے محولہ بالا بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی نہیں انھوں نے ان منصوبوں کو عملی جامہ بھی پہنانا شروع کر دیا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے الفاظ میں انھوں نے ''اس اصلی نسخے کی طباعت کے لیے بڑے بڑے سامان کیے۔ اعلیٰ درجے کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب، طباعت کے لیے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کے لیے چابکدست مصوروں سے تصویروں کی فرمائش۔ ان کا انہماک دیکھ کر ان کے بعض دوست بھی اس شاہکار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہوگئے تھے''۔[2] انھوں نے دوستوں کی مدد سے غالب سے متعلق بہت سے نوادرات بھی اکٹھا کر لیے تھے۔ انھیں میں غالب کا وہ خود نوشتہ سوانحی خاکہ بھی تھا جو بقول بابائے اردو غالباً تذکرۂ ''مظہر العجائب'' کے لیے لکھا گیا تھا۔ سید ہاشمی کے مطابق دیوان کی کتابت کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن بجنوری کی اچانک موت نے ان تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

میرے پیش نظر حسین میاں نامی ایک شخص کا خط ہے، جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر بجنوری کی وفات کے بعد ''نسخۂ بھوپال'' کو حاصل کرنے کے لیے ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے محولہ بالا تبصرے میں بابائے اردو کے حوالے سے ''جس ریاستوں کی پولیٹیکل کشمکش'' کی طرف اشارہ کیا ہے، اس خط سے اس کی حقیقت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ خط[3] یہاں بغیر کسی تبصرے کے نقل کیا جاتا ہے۔

---

[1] سہ ماہی ''اردو'' اکتوبر ۱۹۲۲ء (محولہ بالا تبصرہ)، ص ص ۵ - ۶ - ۷

[2] مقدمات عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ناشر اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ص ۲۷۳

[3] مکتوب نگار کے بارے میں تفصیلات فراہم نہیں ہو سکیں کہ بجنوری مرحوم سے ان کے روابط کی نوعیت کیا تھی بہر حال خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جو ''وفاداری بہ شرط استواری'' کو ''اصل ایمان'' سمجھتے ہیں۔ یہ خط شعیب قریشی کے نام ہے۔

"۱۱ر دسمبر ۱۹۶۸ء بروز بدھ بوقت ۵ بجے شام

جناب پیارے بھائی صاحب

آداب بندگی کے بعد عرض ہے، میں اور تاج خیریت سے ہیں۔ امید ہے کہ آپ سب بھی خیریت سے ہوں گے۔ آپ کا خط ملا۔ چھ سو چھتّر روپیہ دس (آنہ) چھ پائی انشور کر دیا ہے۔ بھتہ کے روپیہ اب تک ملے نہیں ہیں۔ ماسٹر صاحب نے کہا ہے کہ میں دیدوں گا۔ دیوان غالب کا اصلی واقعہ یہ ہے۔ ایجوکیشنل ایڈوائزر کا چارج مفتی انوار الحق صاحب کو دیا گیا ہے اور اس حکم میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ دیوان غالب مرحوم نے نامکمل چھوڑا ہے اور اوسے مفتی صاحب ایڈٹ کریں۔ آج ماسٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ دیوان غالب دیدو کیونکہ میاں[1] نے حکم دیا ہے کہ اوس کو مفتی صاحب ایڈٹ کریں گے اور میاں اوس کو اپنے نام سے چھپوا بیٹھیں گے۔ میں نے اوس کا جواب یہ دیا کہ جب تک سندھی[2] صاحب نہیں آئیں گے کوئی چیز نہیں دے سکتا، نہ تو الماریوں کی کنجیاں میرے پاس ہیں۔ اس وقت مفتی صاحب، ماسٹر صاحب اور مسعود صاحب (نے) مجھے بلوا کر کہا کہ بنگلہ کھولو ہم کچھ کاغذات لیں گے۔ اوس کا جواب میں نے دیا کہ بنگلہ کھولنے کے لیے میں تیار ہوں مگر کاغذات ایک بھی نہیں دوں گا جب تک سندھی صاحب نہ آجائیں۔ اس کے بعد یہ تینوں صاحب بنگلہ میں آئے تھے۔ کمپلسری ایجوکیشن کی اسکیم ڈھونڈی مگر کہیں نہیں ملی۔ اس کے بعد واپس چلے گئے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پرنس نے دیوان غالب کے لیے آڈر تو دیدیا ہے مگر خیال یہ ہے کہ دیوان غالب کا آڈر پرنس کا نہیں ہے۔ اگر پرنس کا ہوتا تو یہ لوگ اتنی عجلت نہ کرتے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں کے بھوپال آنے سے پہلے دیوان غالب ہمارے ہاتھ آجائے۔ میں بہت افسوس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ اس جلاپے کی محبت مرحوم کو بہت تھی اور مرحوم نے اس کے لیے دو مرتبہ مجھے ڈانٹا بھی تھا اور اس کے بیس پچیس روز بعد ہی مرحوم کی کی ہوئی محنت کو خاک میں ملانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے جو تار دیا ہے وہ تار بغیر میاں کے پوچھے دیا گیا ہے۔ براہ مہربانی اگر آپ لوگ مرحوم کی یادگار دیوان غالب کرنا چاہتے ہیں تو دونوں صاحب میں سے کوئی ایک بھوپال تشریف لے آئیں اور میاں سے مل کر دیوان غالب کا فیصلہ کریں اور دیوان غالب کو یہاں سے لے جائیں۔ مجھے شک ہو چلا ہے کہ شاید دیوان غالب چھپوا لیا جائے گا۔ میرے خیال میں آپ دونوں صاحب میں سے ایک صاحب اس خط کو پڑھتے ہی بھوپال تشریف لائیں۔

آج ایک خط مولوی نور الاسلام صاحب کا میاں کے نام آیا ہے۔ معلوم نہیں کیا مضمون ہے۔

---

[1] نواب حمید اللہ خان جو اس زمانے میں پرنس تھے۔
[2] شعیب قریشی۔

مجھے امید ہے کہ اس خط کے ملنے سے آپ کو یہاں کے پولٹیکل معاملات کا جلد خیال ہوگا اور دیوانِ غالب کے معاملہ میں بہت عجلت سے کام کریں گے۔ اگر آپ نے کوئی خط میاں کے نام لکھا تو وہ میاں تک پہنچے گا نہیں۔ اگر میاں کو خط لکھنا ہے تو ابو محمد صاحب کو لکھیئے یا میرے پاس بھیج دیجئے تو میاں کو دوں۔ باقی خیریت ہے۔

اس کام میں جلدی کرنے کی ضرورت ہے۔ سب کی خدمت میں آداب۔ بچوں کو پیار

دعاگو

"حسین میاں" [1]

بالآخر مفتی انوار الحق صاحب "نسخۂ بھوپال" کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ خدشہ کہ "مرحوم کی یہ محنت و کاوش ریاستوں کی پولٹیکل کشمکش میں ضائع ہونا چاہتی ہے" صحیح ثابت ہوا۔ نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر بجنوری کا مرتب کردہ دیوان لاپتہ ہوگیا، بلکہ انھوں نے "نسخۂ بھوپال" کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جو کام کیا تھا وہ بھی برباد ہوگیا۔

---

[1] یہ خط مجھے مولانا خیر بہولاری صاحب سے ملا۔

غالب کا ذہنی سفر

معین الدین عقیل

جدید نفسیات دو بنیادی نظریات پر استوار ہے۔ ایک تو فرائڈ کی "تحلیل نفسی" کا نظریہ ہے۔ اور دوسرا نظریہ "سماج میں فرد" کے مطالعے سے متعلق ہے۔ سماج میں فرد کے مطالعے کے معنی دراصل ان سماجی عوامل (SOCIAL FACTORS) کے مطالعے سے لیے جاتے ہیں جو فرد کے کردار کا تعین کرتے ہیں۔ یا جن سے متاثر ہو کر فرد "کرداری نمونے تشکیل دیتا ہے"۔ اس انداز کا مطالعہ بنیادی طور پر اس صورتِ حال کی تشریح و تجزیہ سے متعلق ہے جس میں ایک خالص حیاتیاتی عضویہ (BIOLOGICAL ORGANISM) ایک حیوی سماجی (BIO-SOCIAL) عضویہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے مطالعے میں جدید نفسیات اعصابی نظام سے بحث کو اہمیت دیتی ہے، اور بیرونی ہیجات یا عوامل عضویہ یا فرد پر جو اثر ہوتا ہے، اس تاثر کے دماغ تک پہنچنے کا اور پھر اس تہیج کے جواب میں جو ردعمل وقوع پزیر ہوتا ہے، اسکے عمل میں لانے کے طریقوں سے تعلق رکھتی ہے۔

بیرونی ہیجات کے تہیج سے اثر قبول کرکے اس کا ردعمل پیش کرنے کی صلاحیت اور خاصیت کو "ذہن" سے تعبیر کیا جاتا ہے جاتا ہے۔

فلسفے کی رو سے ذہن سادہ صفحے سے مشابہ ہے جس پر خارج سے مظاہر کے آثار و نقوش مرتسم ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ایک اساسی اور بنیادی خصلت ہے۔ ایک طبعی ملکہ، جو اپنے خاص قوانین کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ ذہن کی تشکیل بتدریج ان مظاہر سے ہوتی ہے جو اپنے دائمی اور مستقل نسب اور اضافات کی وجہ سے واقعات کے پریشان مجموعے سے جدا اور متمیز ہوتے ہیں۔ اس میں بعض ابتدائی اور بنیادی تصورات ہوتے ہیں۔ جو تجربہ سے ماورا قرار دیے جا سکتے ہیں۔ بعض کلی اور ضروری اصول ہوتے ہیں۔ جو اضافی امور اور واقعات پر حاوی ہوتے ہیں اور ہمیں اس قابل بناتے ہیں کہ ہم مظاہر کے درمیان مستقل رابطہ قائم رکھیں۔

تاریخ فکر انسانی کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ "تغیر" حیات کا اصل راز ہے۔ عالم ہر لمحہ متغیر ہے

جس میں سکون و ثبات نہیں۔ ایتھرسے کہ جوہر تک اور ذہن سے فکر تک تمام۔ ہر لمحہ متغیر و متبدّل ہوتے رہتے ہیں۔
ذہن کو ایک تصور قائم کرنے یا ذہنی تجزیہ کو حاصل کرنے کے لیے چار مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس میں پہلا مرتبہ "انتخاب" کا ہے۔ اس مرحلے پر کسی بھی معروض (OBJECT) یا موضوع (SUBJECT) کو منتخب کیا جاتا ہے، لیکن اسی ثانیہ کے ایک مختصر وقفے میں "تغیر" واقع ہو جاتا ہے، جو دوسرا مرحلہ ہے۔ تیسرا مرحلہ "تسلسل" کا ہے جس میں پہلے مرحلہ "انتخاب" کی تکرار کی جاتی ہے۔ اور اگلے ثانیہ میں "وحدت" قائم ہو جاتی ہے۔ جو چوتھا مرحلہ ہے۔

ذہن و شعور کے ان چار مراحل (۱- انتخاب ۲- تغیر- ۳- تسلسل - ۴- وحدت) سے ایک ہی ثانیہ میں گزر کر کسی تجربہ کا ادراک (PERCEPTION) کیا جا سکتا ہے' یا کسی تصور کو قائم کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان ابتدائے شعور سے انتہائے عمر تک اپنی فکر و نظر میں تغیر و تبدل کا شکار رہتا ہے۔ اس کے ذہن (اور فکر) کا ارتقا علم و تجربات و مشاہدات کا بھی رہین منت ہوتا ہے۔ جس کا تعین عمر کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ اور جیسے جیسے ذہنی استعداد اور صلاحیت میں اضافہ ہوتا جائے گا اسی اعتبار سے سادہ سے پیچیدہ اور پیچیدہ سے پیچیدہ تر موضوع نظر آئے گا۔ ذہنی استعداد اور صلاحیت کے ارتقا میں تجربات و عمل خصوصیت رکھتے ہیں اور ان میں عمر کی مناسبت سے اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ان کی اثر پذیری سے تحصیل (ACHEIVEMENT) اور ادراک میں تغیر واقع ہونا ناگزیر ہے۔

کسی بھی ذہن کے تغیرات کا مطالعہ اس کے دوری مراحل یا سوانحی ادوار، افکار و نظریات، عقائد و تخیلات کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے مطالعے میں فرد کے جبلات و میلانات اور عواطف SENTIMENTS کے ساتھ ہی سماجی عوامل اور اس کے تعلقات، فکری و عملی ماحول کے روابط میں اثر اندازی اور اثر پذیری کی کیفیات سے مدد لی جا سکتی ہے۔ چنانچہ — غالب کے ذہنی تغیرات کا جائزہ بھی اس طور پر لیا جا سکتا ہے۔

انسانی ذہن کی نمو اور پرورش کا دار و مدار اس کے بچپن پر منحصر ہے۔ نفسیات کی رو سے عمر کے ابتدائی تین یا سات سال فرد کی زندگی کے رجحانات، میلانات، اور پھر اس کے نصب العین کا تعین کرتے ہیں۔ اس دوران فرد غیر ارادی طور پر اپنے لیے راہیں متعین کر لیتا ہے۔ اور چونکہ اس عمر میں اس کا ذہن خام ہوتا ہے اس لیے وہ کسی نظریہ، نظام حیات اور کسی فلسفے سے متاثر نہیں رہتا۔ اس کا ذہن سادہ صفحے کی مانند کورا ہوتا ہے اور موم کی طرح ملائم جس پر کوئی بھی نقش، نقش دوام ہو سکتا ہے۔

زندگی کی طویل جہد مسلسل کے لیے فرد کو کسی نہ کسی آدرش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس کے وجود کے معنوی تقاضوں کو پورا کر سکے اور یہیں سے نصب العین کی وہ جستجو پیدا ہوتی ہے جو اس آدرش کی ثبوتیت میں مدد رہتی ہے۔

حالات و واقعات کے زیر اثر انسانی وجود بھی تغیر و تبدل قبول کرتا رہتا ہے۔ اس لیے اس کے نصب العین یا آدرش میں بھی ترمیم و تخفیف ہوتی رہتی ہے۔ لیکن نفسیات کی رو سے فرد میں عمر کی ایک خاص حد تک پہنچ کر عادات پختہ

ہو جاتی ہیں۔ اور اخذ و اصلاح کا عمل فرد کے لیے زیادہ موثر نہیں رہتا۔ فرد کا وجود آدرش اور نصب العین جمود اور استقلال کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر اخذ و تحصیل اور رحک و اصلاح کا ارتقائی تسلسل منقطع ہو جاتا ہے۔

جو افراد اپنے تجربے اور مشاہدے یا اپنی ایجابیت (POSITIVITY) پر اصرار نہیں کرتے وہ انتہائی عمر تک زمانے سے ہم آہنگ رہتے ہیں۔ ان کا حیاتیاتی وجود تو بوڑھا ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کا ذوقِ تجسس برقرار رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے قول و فعل میں بچپن کی خصلتیں بھی شرارت و شوخی کی شکل میں جھلکتی رہتی ہیں۔ غالب کی شاعری میں فکری سنجیدگی کی انتہائی منزلوں پر بھی شوخی و ظرافت کا عنصر نظر آتا ہے۔ اس کی بھی یہی نفسیاتی وجوہات ہیں ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی !

یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

بیشتر شاعروں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان میں سوقیت تر ہے۔ لیکن خودداری کا جذبہ نہیں۔ غالب نے بھی گاہے گاہے اپنی سوقیت کا اظہار کیا ہے لیکن اس کا طبعی میلان خودداری کی طرف ہے۔ خود اس کی زندگی بھی اس کا مظہر ہے۔ اس نے اپنی خودداری کا اظہار کثرت سے اپنے اشعار میں کیا ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں، ہیں کہ ہم

الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

مضطرب و متجسس نظریں اپنے مشاہدے کے سبب بہت کم عرصے میں بہت زیادہ حقائق کو اپنے حیطۂ ادراک (SPAN OF PERCEPTION) میں سمیٹ لیتی ہیں۔ اور نفسیاتی اعتبار سے خود اعتمادی اور شخصی انفرادیت کے احساس کا باعث بنتی ہے۔ یہ احساس دیگر افراد کے مقابلے میں احساس برتری کا نتیجہ ہوتا ہے۔

واقعیت اور حقیقت سے آگاہی اور خود اعتمادی کے پیدا کردہ احساسات دراوصاف مختلط ہو کر انانیت کو جنم دیتے ہیں۔

غالب کے زمانے کی صورتِ حال اور تقاضے اور سماجی ضروریات کی تکمیل کے خیال کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو شہنشاہِ وقت کی بندگی اختیار کرنا کسی بھی شخص کے شخصی وقار کے منافی محسوس نہ ہوگا۔ لیکن جب سماجی تقاضوں سے مجبور ہو کر غالب نے شہنشاہِ وقت کی مصاحبت قبول کر لی تو اس کی خودداری اور اس کی آزادہ روی خود اس طنز کا شکار بن گئی اور وہ خود اپنے شخصی وقار پر حرف زن نظر آنے لگا ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے !

اس بے ابروئی کے احساس نے اس کو اپنی ہی نظروں سے گرا دیا۔ اس احساس سے گریز پائی کے لیے اس نے مختلف روپ دھارے کہیں شوخی کا سوانگ رچا کر معتقدات پر چوٹیں کیں۔ کہیں سنجیدگی کا رنگ اختیار کر کے تفلسف کے اسرار دکائنات دمافیہ سے متعلق اپنی حیرت کو رفع کیا اور اس طور پر اس کی فطرت کو کہیں بھی ثبات نہ ہوا کیونکہ اس کا مزاج کسی منزل کی پابندی قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اور جب اسے کوئی راہ نظر نہ آئی تو وہ اپنی شخصیت میں سمٹ کر دردں بینی کرتا ہے ؎

شرحِ اسباب گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

فرد معاشرہ کا ایک رکن ہے۔ اس کی ذات سرچشمۂ حیات دکائنات سے ملوث ہے۔ خود کو اس تعلق سے علیحدہ سمجھا اور اس منقطع اور محدود "انا" کی بنا پر سوچنا اور عمل کرنا، حکمت اور اخلاق دونوں کے لیے مضرت رساں ہے غالب یہ کہہ کر کہ انسان کو بذات خود ایک مستقل حیثیت سے موجود ہونے کا خیال ہی بے ڈھب بنا ہے، اکابر صوفیہ کی ہم نوائی کرتا نظر آتا ہے۔ یہ فنا دبقا کا مسئلہ جس پر تصوف کا دارو مدار ہے اکابر حکما ء اور صوفیہ کے بیچ بے انتہا اختلاف رائے کا حامل ہے۔ لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ انسانی خودی کو محدود سے لامحدود کی طرف مسلسل سفر کرنا چاہیئے۔

غالب کے ذہن میں انسان ایک ایسے وجود کی علامت ہے کہ جس کو جب تک پارہ پارہ نہ کیا جائے مقصودِ حیات، آدرش اور نصب العین حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن وحدت الشہود کے نظریے کو تسلیم کرتے ہوئے بھی وہ اپنی طبعیت کے تضاد کو رفع نہ کر سکا۔ نظریاتی لحاظ سے وہ وحدت الوجود کا قائل ہے اور ساری ہستی کو خواب تصور کرتا ہے۔ خواہ وہ خدا ہی کا خیال ہو ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غالب فطری طور پر متجسس ذہن رکھتا تھا۔ وہ ہر انداز کو اپنا کر اس کے روپ سے متعارف ہونا چاہتا تھا۔ اس کی ہر لمحہ بیدار رہنے والی نظریں جب اپنی ذات اور دیگر انسانوں کی اجتماعی زندگی سے ماورا اپنے اردگرد پھیلے ہوئے ماحول پر پڑتیں تو متنوع تجربات اور بوقلموں مشاہدات سے روشناس ہوتیں۔ اس سے پیدا شدہ تخیل اور تمثّل اس کے احساسات میں تحریک پیدا کر دیتے۔ اور یہ تحریک جذبے کی حیثیت سے غالب کی شاعری کو متیز کرتی نظر آتی ہے ؎

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے!

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

انسانی ذہن انتہائی طور پر انفرادیت کا حامل ہوتے ہوئے بھی عوامل سیہ اور مروجہ انداز سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ جب تک انسانی تجسس خالص اور مبترانہ ہو اور ذہن تلاش حقیقت کے ضمن میں بچے کی طرح کسی بھی قسم کے تلازمات ذہنی سے غیر آلودہ نہ ہو اور بے تعلق اور غیر جانبدار نہ ہو، حقیقت اور اس کی تفہیم ممکن نہیں اس احساس سے غالب واقف تھا

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ تعصبات ذہنی، طبع انسانی کو ناقص کر دیتے ہیں مشاہدے کی وسعت اس کا تدارک کر دیتی ہے غالب جس موثر انداز سے پیش کرتا ہے اور جس کثرتِ نظارہ کی تلقین کرتا ہے اور اسے حسد کا علاج بتاتا ہے۔ وہ خارجی اور باطنی یا قرآن الحکیم کی اصطلاح میں "آفاق" اور "انفس" دونوں کا مطالعہ و مشاہدہ ہے۔ نفس انسانی کے باطنی حقائق "انفس کے مطالعے میں شامل ہیں۔ اور مظاہر کا ادراک "آفاق" کے مشاہدے میں شامل ہے۔ غالب کا ذہن اس امر کو قبول کرتا ہے۔ کہ کثرت نظارہ سے انسان کو بذات خود ادراک کیا ہے اور اس نے زندگی کی بوقلمونیوں میں سے حقیقت کو محسوس کر کے شعری قالب میں ڈھالا ہے۔

مظاہر کی تہ میں موجود حقیقت کو اساطیر کے ذریعے پہچان لینا صرف ان افراد کا وصف ہے جو محض انفس کا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ آفاق پر بھی ان متجسس نظریں پڑتی رہتی ہیں۔ یہ نفسیاتی حقیقت ایک مخصوص ذہن ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت عمومی ہے اور اس کا تعلق تمام انسانوں کی نفسیات سے ہے۔ غالب نے نہ صرف اپنی ذات کی گہرائیوں تک اترنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس کی بصری حس نے خارجی کائنات کے متنوع مظاہر کو بھی اپنے حیطۂ ادراک میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے داخلیت اور خارجیت کے اس اختلاط اور امتزاج سے غالب کا اپنا ذہن اور اس کا اپنا مزاج متشکل ہوا ہے۔ داخلیت یا باطنی کیفیات دوار ذات کا وجودی اجسام میں اظہار فنکارانہ خلاقی کے بغیر ممکن نہیں اور یہی خلاقی فنکار کی تخلیق کی انفرادیت کو متعین کرتی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن میں اس کی اپنی اپچ اور طباعی کتنی ہے۔ غالب نے اس حقیقت کا اظہار اس طرح ہوتا ہے ؎

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

عرفانِ ذات ہی کی خصوصیات ہیں کہ غالب کی شاعری میں ہمیں حرکی کیفیات ملتی ہیں۔ احساسِ ذات اور اس کے معنوی وجود کی تلاش — غالب کی اس ابتدائی عمر کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ جب اس نے اپنے ماحول، کائنات اور اسکے مظاہر کے باہمی فرق کو محسوس کیا اور اپنی ذات کے عرفان سے اس نے اپنی "انا" کو مستحکم کر کے اور فطرت کے رحم و کرم پر زندہ رہنے کے بجائے اپنے بازوؤں کی توانائی پر بھروسہ کیا۔ اور یوں غالب ہمارے لیے حرکی کیفیات کا مظہر ثابت ہوتا ہے :۔

شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ!

اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

ہنگامۂ قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

عرفان کی یہ کیفیت اور یہ طرزِ عمل تجزیاتی ذہن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ انسانی نفسیات سے واقفیت کا یہ عالم اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ کسی انسان کے اندر اپنی ذات کو انفرادی حیثیت دے کر پرکھنے کی عادت نہ ہو۔ نفسیات کے وہ پہلو جن سے افراد کے ردِ عمل متعین ہوتے ہیں اور اہمیت کے اعتبار سے لازمی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب کی نگاہ سے پوشیدہ نہ تھے۔ جب کہ اس کے زمانے میں نفسیات کوئی باقاعدہ موضوع نہ تھا۔

جب انسان اپنے نفس یا اپنی ذات کے مطالعے اور اس کی اصلیت سے واقف ہونے لگتا ہے۔ تو اس میں اپنی ذات یا نفس سے ماورا کائنات کے بیکراں سلسلے یا آفاق کو سمجھنے کی جستجو پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور یہ جستجو اس کے حیطۂ فکر کو وسیع تر کر دیتی ہے اور اس کا ذہن ان سوالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ جو انفس و آفاق پر محیط ہوتے ہیں اور یوں اسکا حیطۂ فکر اس کی اپنی ذات سے بیکراں کائنات کے بیکراں سلسلوں تک پھیل جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح غالب نے بھی اپنی ذات سے ماورا کائنات کے وسیع و عریض سلسلوں تک ذہنی سفر کیا ہے۔ وہ استقرائی فکر (INDUCTIVE) انداز فکر کو اختیار کرتے ہوئے حقیقتوں کے ان بنیادی عناصر کی جستجو میں رہتا ہے۔ جن کے بطن سے مظاہر کائنات کی چھوٹی اکائیاں جنم لیتی ہیں۔ اور جزئیات کو سمیٹتے ہوئے اس کی نگاہیں کلیات کو اہمیت دیتی ہیں۔

ربط اک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار

سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا!

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ماہیت عالم کے باب میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ یہ وجدانی ہوتا ہے یا عقلی علم کی تبویت ذہنی نظریے سے موسوم ہوتی ہے۔ کچھ نظریات عقلی تسلیم کیے جاتے ہیں اور کچھ نظریات کا مدار وجدان پر ہوتا ہے۔ غالب کی ذہنی کیفیات کے اعتبار سے شہادت ملتی ہے کہ عالم محسوسات کا اعتباری یا معدوم ہونا۔ بطور وجدان اس پر طاری ہوتا ہے۔ جس سے اس کے عقل و احساس میں تفریق پیدا کرنا دشوار ہو جاتا ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے سب و روز تماشا میرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں میرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا میرے آگے
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں، صورت اشیا میرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا میرے آگے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا میرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

ان اشعار میں کائنات اور مافیہا کے باب میں جس زاویۂ نگاہ کا اظہار ہوتا ہے، وہ ایک نفسی کیفیت ہے۔ جس کے تحت استفہام ہوتا ہے کہ یہ عالم اور اس کے حوادث مظاہر حقیقی ہیں یا اعتباری، حقیقت ہے یا فریب ادراک، اصلیت ہے یا وہم۔ مندرجہ صدر اشعار کی رو سے غالب کا ذہن دو قسم کے احساسات کی آماجگاہ نظر آتا ہے۔ ایک احساس تو یہ ہے کہ صورت عالم اصلی نہیں بلکہ وہمی ہے یا ادارک کا پیدا کردہ ایک سراب وجود ہے۔ لیکن غالب نے ابتداً مظاہر عالم کو وہم نہیں بلکہ کھیل تماشے سے تعبیر کیا ہے۔ احساس وہم کے مقابلے میں یہ ایک الگ قسم کا احساس اور ایک علیحدہ نوع کی نفسی کیفیت ہے کہ جب کوئی فرد حرص اور ہوس کی کشمکش اور زندگی کی جدوجہد میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو اس حالت میں کسی چیز کے وہمی ہونے کا گمان اس کے دل میں نہیں گزرتا۔ نفس اشیاء و حوادث سے الگ ہو کر مظاہر کو بے تعلق ناظر کی حیثیت سے دیکھنے کے لیے متوجہ ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہ

تعلقات کے الجھاؤ میں محو ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں جب اپنی گذشتہ زندگی، دوسروں کے احوال اور تاریخ انسانی پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس بے تعلقی کے زاویہ نگاہ سے اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل حوادث نہ تھے بلکہ محض ایک تماشا تھا۔

یہ بھی تھی اک سلیما کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

اس نقطۂ نظر سے "اورنگ سلیمان" ہو یا "اعجاز مسیحا" سب "بازیچۂ اطفال" کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ زندگی کو محض بازیچۂ اطفال سمجھنا، اورنگ سلیمانی اور اعجازِ مسیحائی کو کھیل سمجھنا بعض دینی معتقدات کے لحاظ سے کفر یا مباح معلوم ہوتا ہے لیکن محسوس کرنے والا اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی سمجھنے پر مجبور ہے۔ اور اس کے نتیجے میں وہ اس زمان و مکان کی حامل کائنات کو تمنائے حیات کے ایک قدم سے تعبیر کرتا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

اور جب اسے اس لامحدود تخلیقی قوت کا دوسرا قدم نہیں ملتا جہاں نہ یہ علت و معلول کا سلسلہ ہوگا۔ اور نہ محسوسات و معقولات کا ہیر پھیر تو وہ حیرت زدہ استفہام کرتا ہے:

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں!
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہاں غالب سراپا سوال ہے۔ عقل و تجربہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتے، اسلئے جواب کی طرف سے سکوت ہے۔ خدا اور کائنات، ذات اور صفات، عین اور مظاہر کا رابطہ عقل کے لیے پوری طرح قابل فہم نہیں ہو سکتا۔ "لامحدود" عقل میں نہیں سما سکتا۔

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے!
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

اسلئے فہم کا انجام حیرت ہے لیکن حیرت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حیرت تو وہ ہے جو زندگی کی لاانتہائی اور فہم کی نارسائی سے پیدا ہوتی ہے یہ حیرت عقل صالح کی پیداوار ہے جو خود ایک طرح کا عرفان ہے۔ ایک حیرت اور ہے جو عقل کے غلط استعمال کی پیداوار ہے۔ جس کے تحت زندگی کے متعلق غلط مفروضات

قائم کیے جاتے ہیں۔ پھر گمراہی کے چکر میں پڑ کر حیرت زدہ ہوتے ہیں۔ کہ مسئلہ لاینحل ہو گیا۔ غالب کے مندرجہ صدر اشعار وحدت و کثرت کے غلط مسائل سے پیدا شدہ حیرانی کا اظہار کرتے ہیں یہ عارفانہ حیرت نہیں بلکہ منطقیانہ ہے

تجربیت اور راور ایجابیت کا قائل فرد شنیدہ پر بہت کم یقین رکھتا ہے۔ اس لیے روایت کے احترام کے باوجود روایت کو بعینہٖ قبول نہیں کرتا وہ مسلمات اور معتقدات کے تجزیئے اور تحلیل کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ یہ امر اس کے پیش نظر رہتا ہے۔ کہ صدیوں سے انسان اس کو تسلیم کرتا چلا آ رہا ہے اور پھر اس کے معاصرین میں بھی ان پر ایمان رکھنے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ لیکن اسے اس کی خوب سے خوب تر کی تلاش اس ڈھب سے متاثر ہونے نہیں دیتی کہ وہ حالات کی اس نوعیت سے اثر پذیر ہو جائے اور مقلدین کے گروہ میں خود کو شامل کرے، ؎

میں اہل خرد کس روشِ ناز پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

غالب کے نت نئے حقائق کی متلاشی شخصیت کچھ اسی نوعیت کے پس منظر میں اپنی انفرادیت تسلیم کراتی ہے۔ مثلاً جب وہ مسلک عشق کے مثالی عاشق، فرہاد کو جسے ایثار و وفاداری کے اعتبار سے منفرد سمجھا جاتا ہے۔ "سرگشتۂ خمار رسوم و قیود" قرار دیتا ہے اور "ہم کو تسلیم نکونامیٔ فرہاد نہیں" کہتا ہے تو ہمیں غالب ایک آزاد منش آزادرو شخص نظر آتا ہے۔ جس کی آزادہ روی کبھی بے راہ روی بن جاتی ہے جس کی آزاد روی کبھی بے راہ روی بن جاتی ہے اور کبھی ندرت آفریں، یہی مخصوص انداز طبیعت اور فلسفۂ حیات غالب کا خاصہ نظر آتا ہے جو افکار و عقائد دونوں میں آزاد تھا ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم میں تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

فرہاد کی انفعالیت اور منصور کی بے حوصلگی میں اسے زندگی کی بے لاگ اور رواں دواں توانائی نظر نہیں آتی۔ اس لیے وہ ان پر حرف زن ہے۔ اور اسے شکایت یہ ہے کہ ان کا عشق بے لوث نہ تھا اور ان کا طرز عمل کسی انقلابی کا طرز عمل نہ تھا۔ بلکہ ایک عام اور معمولی سطح کے انسان کا طرز عمل تھا۔ اس کی افتادِ طبع نے ان دونوں کے برعکس قیس کے طرز عمل کا اعتراف کیا ہے جس کا سارا عمل حرکت و توانائی کا عمل ہے۔ صحرا کی تنگ اور ساکن فضا میں جس کا وجود وسعت طلبی، ہنگامہ آرائی کی علامت ہے ؎

عالم غبارِ وحشت مجنوں ہے سربسر
کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

غالب کی سیمابی شخصیت نے اپنا اظہار اس فرد کی مانند کیا ہے جو بے عمل اور افتادہ معاشرتی ماحول سے گریز کرتا ہے۔ اور ایسے ماحول اور افراد کا متلاشی رہتا ہے جو اس کی جذباتی زندگی میں تحریک پیدا کریں اور ذہنی آسودگی کا باعث بنیں۔ اس کا اضطراب اور خوب سے خوب کا متلاشی جذبہ قوی اور موثر تھا۔ جس کے زیر اثر وہ اپنی ذات کی گہرائیوں سے نکل کر اپنے ارد گرد کی فضا کو محسوس کرتا ہے اور اس کی آگہی کے بعد کائنات کی لامحدود وسعتوں کو اپنے حیطۂ نگر داری میں سمیٹ لینا چاہتا ہے اور اسی جذبے کے تحت غالب نے اپنی ذات کی گہرائیوں سے لیکر کائنات کی لامحدود وسعتوں تک کا ذہنی سفر طے کیا ہے۔

شاعر امروز و فردا

ابو سلمان شاہجہان پوری

علمی تحقیق کے معاملے میں اگرچہ کسی مقام پر بھی مطمئن نہیں ہوا جا سکتا۔ جب ایک محقق ایک مرحلہ طے کر کے اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔ جو اس کی نظر میں آخری مرحلہ ہوتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　　ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

لیکن کچھ اصحاب ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کے نقطہ نظر، اور نتائج تحقیق پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ تحقیق کے مقامات و مراحل سے سرسری گزر جانے سے کام نہیں چلتا اگر میر کی شاعرانہ روش ؎

ٹک دیکھ لیا، دل شاد ہوئے اور چل نکلے

اختیار کی جائے تو اس سے مسائل الجھتے اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ محقق کبھی مقام علم اور کسی مرحلۂ تحقیق پر سرسری نظر ڈال کر نہیں گزر سکتا۔ سبک ساران ساحل تحقیق کے مراحل ہمت شکن کے صحیح اندازہ شناس نہیں ہو سکتے ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان تمام آداب تحقیق سے صرف علمی و نظری طور پر ہی واقف نہیں بلکہ وہ انہیں اپنی تحقیق میں برتتے بھی ہیں اس لیے اصحاب تحقیق میں وہ ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ میں یہ بات سوچ سمجھ کر اور مطالعے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں اور فرمان صاحب کا تازہ مجموعہ مضامین "غالب شاعر امروز و فردا" کا ہر مقالہ اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس مجموعے میں غالب کی شخصیت، فن، عہد، اور دیگر حالات و کوائف متعلق غالب پر فرمان صاحب کے متفرق تحقیقی و تنقیدی مقالات ہیں جو اس سے پہلے پاک و ہند کے مختلف علمی جریدوں میں شائع ہو کر غالب سے دلچسپی رکھنے والوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ لیکن جرائد میں چھپی ہوئی چیزیں بعض اوقات ہر صاحب نظر کے علم میں بھی نہیں آتیں اور عام طور پر ایک مدت کے بعد اہل علم کی دسترس سے باہر ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس قسم کے علمی جواہر ریزوں کو کتابی صورت میں شائع کر کے ان کا حصول آسان اور ان سے استفادہ ممکن بنا دیا جائے

تحقیق کے ساتھ تنقیدی صلاحتیں ایک شخصیت میں شاذ ہی جمع ہوتی ہیں اور کسی شخصیت میں ان کمالات کا جمع ہونا یک کفِ جام شریعت یک کفِ سندان عشق کی آزمائش ہوتی ہے۔ اس لیے کہ دونوں کے عالم جدا جدا اور دونوں کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور مختلف تقاضوں اور متضاد ذمہ داریوں سے کسی مصنف کا عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہوتا لیکن فرمان صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ جس طرح بلند پایہ محقق ہیں اسی طرح بالغ نظر اور نکتہ رس نقاد بھی ہیں۔ ان دونوں صلاحیتوں میں کسی ایک کو اولیت دی جا سکتی ہے اور بلاشبہ میری نظر میں وہ محقق پہلے ہیں نقاد بعد میں لیکن ان کی اس خوبی اور خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس مجموعے میں ان کے تنقیدی مضامین ان میں تنقید کے کمالِ شعور کا بہترین ثبوت ہیں۔

تحقیقی مضامین میں غالب کے اولین تعارف نگار، غالب اور غالبؔ کے اردو شعرا غالبؔ کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز اور غالب کے حالات میں پہلا مضمون، ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض موضوعات پر اور بھی کئی اصحاب نے قلم اٹھایا ہے ان کی افادیت بھی مسلم ہے اور ان سے بعض نئی معلومات کا پتا بھی چلتا ہے۔ کتاب، لاہور کے ایک تبصرہ نگار کی تحقیق کے مطابق غالب کی وفات کے بعد ان کے حالات میں پہلا مضمون وہ نہیں جس کی نشاندہی فرمان صاحب نے کی ہے۔ بلکہ وہ ایک دوسرا مضمون ہے۔ اگر اس خیال کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی فرمان صاحب کے مضامین کی اہمیت اور ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے یہ مضامین بڑی محنت اور تحقیق کے بعد مرتب کیے ہیں۔ ایک مضمون میں غالب اور اقبال کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ مضمون نہایت مفصل اور نہایت دلچسپ ہے۔ اس سے ان دونوں شاعروں کی عظمت کا اندازہ بھی ہوتا نیز اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ غالب اور اقبال دونوں دو الگ الگ دنیاؤں کے شاعر تھے لیکن ان دونوں کے کلام میں وہ خصوصیات تھیں جنھوں نے انھیں اس عہد کا اردو اور فارسی کا عظیم شاعر بنایا فرمان صاحب غالبؔ کے کلام میں کسی فلسفے یا تصوف یا کسی دعوت یا فکری ہم آہنگی کے قائل معلوم نہیں ہوتے ان کے نزدیک غالب کی عظمت اور اس کی مقبولیت کے اسباب اقبال کی عظمت اور مقبولیت کے اسباب سے بالکل مختلف ہیں۔

ایک مضمون آسی مرحوم کی مکمل شرح دیوان غالب پر ہے۔ لیکن اسے تنقیدی مضمون کی بجائے ایک سرسری نظر یا تبصرہ کہنا چاہیے اس میں فرمان صاحب نے ان کی شرح سے مثالیں دے کر بتایا ہے کہ وہ تشریح اور تفہیم غالب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔ فرمان صاحب کا کہنا ہے کہ "آسی صاحب کہیں کہیں تو سہل ممتنع کے اشعار کی مطلب نگاری سے بھی پورے طور عہدہ برآ نہیں ہو سکے" اپنی اس رائے کے ثبوت میں انھوں نے کچھ مثالیں بھی دی ہیں۔ اگر ان پر پوری شرح کو قیاس کر لیا جائے تو بلاشبہ ناقد کی رائے درست ہے لیکن میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے اور پوری شرح کے بارے میں یہ رائے قائم کر لینا مبالغے سے خالی نہ ہوگا۔

"غالب کے اسلوب سخن کا ایک پہلو" فرمان صاحب نے اس مضمون میں غالب کی ظرافت اور طنز کو موضوع بنایا ہے
سلسلے میں انھوں نے جو گہر افشانی کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایک نئے عالم معنی میں پہنچا دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر طنز وظرافت
حقیقی لطف ہی نہیں آتا بلکہ فکر و شعور کو جلا بھی ملتی ہے۔ اسی طرح "غالب کے کلام میں استفہام" نہایت عمدہ اور
انگیز مضمون ہے۔ "غالب نسخہ حمیدیہ کی روشنی میں، اور غالب کے مقطعے" دونوں اچھے مضمون ہیں۔ لیکن غالب شاعر
روز و فردا، اور "گنجینۂ معنی کا طلسم"، میں فرمان کا تنقیدی شعور، ان کے فکر رسا کی بلند پروازی اور ان کے قلم
رت کاری اپنے عروج پر پہنچ گئی ہے۔ مصنف کے لیے تو اس کی تمام تخلیقات اولاد معنوی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس
یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے ایک یا چند مضامین کو دوسرے مضامین پر ترجیح دی جائے لیکن اگر پسند کا اظہار
دینا نامناسب نہ ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں مضمون مجموعے کا حاصل ہیں۔ شاید ان کی پسند بھی
ہے اور اسی پسندیدگی کی بنا پر کتاب کا نام بھی ان میں سے ایک مضمون کے عنوان کو قرار دیا گیا ہے۔

اس مضمون میں فرمان صاحب نے یہ بتایا ہے کہ غالب کے وہ شاعرانہ کمالات کیا تھے جنھوں نے غالب کو امروز
فردا دونوں کا شاعر بنا دیا ان کمالات اور غالب کی شاعری کی خصوصیات کی تلاش اور نشان دہی میں مصنف نے
ایت بالغ نظری، دیدہ وری، نکتہ رسی، فن سے کمال واقفیت اور تنقیدی شعور کی انتہائی بلندی اور پختگی کا ثبوت
ہے۔ فرمان صاحب کی رائے ہے کہ غالب کے شاعرانہ مرتبے کے تعین میں ان کی اردو شاعری، بر
رسی شاعری ہی کو ترجیح دینے کے معاملے میں ان کی اپنی رائے اور ان کے تنقیدی افکار شاعری اور
کی سیرت، کردار اور عقائد وغیرہ کے سلسلے میں صرف ان کے اپنے بیانات کو حرف آخر سمجھ لینے سے کیا کیا الجھاؤ پیدا
ہوتے ہیں۔ محقق یا تنقید نگار کا صرف یہی کام نہیں کہ غالب کے چند اشعار سامنے رکھے اور ان کی سیرت، افکار
بارے میں فیصلہ کر دے۔ یہ مضمون ہمیں اس قسم کے مباحث پر مشتمل تنقیدی و تحقیقی مضامین کو جانچنے اور
کا معیار متعین کرنے میں ایک میزان کا کام دیتا ہے۔ یہ مضمون اس پائے کا ہے کہ اگر فرمان صاحب اس مضمون کے
تنقید میں اور کچھ نہ لکھتے تب بھی وہ صف اول کے نقاد مان لیے جاتے اور اردو نقد کی تاریخ میں ان کا نام
شہ کے لیے زندہ ہو جاتا۔

مجموعے کے آخری مضمون کا عنوان غالب کا یہ مصرع ہے۔

'اے کاش کبھی معرض اظہار میں آوے'

مضمون دراصل مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی کے ایک سوال کا جواب ہے جس میں پوچھا گیا تھا کہ غالب نے
کی ذہنی، فکری اور جذباتی زندگی کو کس عنوان سے متاثر کیا؟" یہ مضمون غالب کے فنی تنقیدی تجزیے پر مبنی نہیں
بلکہ نقاد کے تاثرات پر مشتمل ہے۔ اور مطالعے کا یہ ایسا پہلو ہے کہ احساسات و تاثرات میں ایک ہزار میں

دو شخص بھی یکساں مشکل سے نکلیں گے۔

اس کتاب کی اشاعت سے غالبیات میں ایک اہم اور نہایت قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ معنوی خوبیوں کے علاوہ ظاہری زیب و زینت کا بھی کافی اہتمام کیا گیا ہے لیکن یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ پروف ریڈنگ میں توجہ نہیں دی گئی اور بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ جن کی وجہ سے بار بار مطالعے میں بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔

تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کی یہ کتاب ٹائپ میں، سفید کاغذ پر، مجلد مع گرد پوش کے اظہار سنز، لاہور نے شائع کی ہے۔ اس کی قیمت سولہ روپے ہے، جو بہت زیادہ ہے۔

مطائبات غالب

محمد ایوب قادری

مرزا غالب کی طبیعت میں مزاح و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جس کا واضح ثبوت ان کے خطوط ہیں۔ مرزا غم روزگار کو ظرافت کے سہارے ہلکا کر لیتے تھے۔ حالیؔ نے مرزا غالبؔ کو حیوانِ ناطق کی بجائے حیوان ظریف کہا ہے۔ مرزا غالب کے لطائف کا مجموعہ "غالب کے لطیفے" کے عنوان سے شائع بھی ہو چکا ہے [1]

مرزا غالب کے چند مطائبات ہمیں جناب مفتی صابر حسن شیدا بریلوی صاحب کے ذریعے ملے ہیں۔ جو انھوں نے اپنے والد مفتی عماد الحسن (ف ۱۹۲۶ء) سے سنے ہیں اور ان کو یہ روایات مرزا غالب کے شاگرد مفتی سلطان حسن بریلوی (ف ۱۲۹۹ھ) اور مولوی غلام بسم اللہ بسملؔ (ف ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء) سے براہ راست ملیں جن میں اول الذکر محو کے والد اور ثانی الذکر ان کے استاد ہیں۔

پینے پلانے کا کوئی سامان نہیں

حضرت قبلہ دادا صاحب مولانا مولوی مفتی محمد سلطان حسن خاں صاحب علیہ الرحمۃ ایک زمانے میں میرٹھ میں منصف تھے اور غالباً یہی وہ زمانہ ہے جب دادا صاحب قبلہ مرزا سے اصلاح لیتے تھے۔ مولوی غلام بسم اللہ صاحب بسملؔ ناظر عدالت تھے۔ مرزا غالب حضرت شیفتہ کے پاس جہانگیر آباد آئے ہوئے تھے اور ناظر صاحب دادا صاحب نے طے کیا کہ اجلاس برخاست کر کے بذریعہ ڈاک پالکی نواب صاحب کے یہاں مرزا سے ملنے کے لیے چلنا چاہیے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات جہانگیر آباد کو روانہ ہو گئے۔ مسافت کافی تھی باوجود کوشش پہنچنے میں تاخیر ہو گئی اور مرزا اپنے کھانے کے کمرے میں جا چکے تھے۔ نواب صاحب کو ان حضرات کے آنے کی اطلاع ملی تو موصوف فوراً باہر تشریف لے آئے۔ سلام و دعا اور رسمی مزاج پرسی کے بعد نواب صاحب نے فرمایا کہ اب تو مرزا سے ملاقات نہ ہو سکے گی کہ کھانے وہ پر چلے گئے۔ یہ بات مشہور تھی کہ مرزا رات کو کھانے کے بعد پیتے ہیں اور پھر کسی سے نہیں ملتے۔ ان حضرات کے لیے یہ دشواری تھی کہ بغیر رخصت لیے گئے تھے اور صبح پھر اجلاس کرنا تھا۔ آخر طے پایا کہ مرزا کے کمرے کے پاس بیٹھ کر بات چیت کرنی چاہیے۔ اگر انھوں نے سن لیا۔

[1] غالب کے لطیفے مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۴۳ء

اور بلالیا تو سبحان اللہ ورنہ محرومی تو ہے ہی۔

حسن اتفاق کہ ان صاحبان نے جو کچھ سوچا تھا وہی ہوا۔ یہ سب حضرات غیر معمولی آواز میں بات چیت کر رہے تھے کہ مرزا نے نواب صاحب سے دریافت کیا کہ نواب صاحب! کون صاحب ہیں؟ انھوں نے جواباً کہا کہ مولانا سلطان حسن خان صاحب ہیں اور سکتر شاعراں (یعنی مولوی غلام بسم اللہ صاحب بسمل کو مرزا کا دیا ہوا خطاب تھا)

چنانچہ مرزا نے اپنے ملازم خاص سے باواز بلند کہا بلاؤ ان حضرات کو، قدرے توقف سے دروازہ کھلا اور ان حضرات کو اندر بلایا گیا۔ (ان حضرات نے فرمایا کہ غالباً یہ توقف پینے پلانے کا سامان سمیٹنے کی وجہ سے ہوا) سلام و دعا کے بعد مرزا نے کہا کہ بھائی میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ مجھ وہاں کے لیے دو ایسے معزز گواہ مل گئے کہ جن میں ایک بہت بڑے عالم دین ہیں اور دوسرے بہت بڑے نعت گو ہیں۔ آپ صاحبان دیکھ لیں کہ یہاں پینے پلانے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ بات ہنسی میں پڑ گئی۔

بسمل صاحب اور دادا صاحب نے کچھ تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی۔ مرزا نے معذرت کی کہ میں نے اس عرصے میں کچھ کہا نہیں ہے۔ جب ان حضرت کا اصرار بڑھا تو مرزا نے قلمدان مانگا اور قلم اٹھا کر ڈبو لیا اور پشت قلم کو منہ میں لیا اور دو رباعیاں فوراً کہہ کر سنا دیں۔

والد صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ اس قرینے سے اس کی فکر اور انداز فکر کا طریقہ ذہن میں آتا ہے۔ یہ رباعیاں مرزا کے مطبوعہ کلام میں نہیں ہیں۔ نہ تو موصوف ہی نے ان کو محفوظ کیا اور نہ مجھ ہی کو یہ توفیق ہو سکی۔ خیال تھا کہ کبھی لکھ لیا جائے گا۔

واہ بے لڑکے پڑھی اچھی غزل

ایک واقعہ ان کی مردم شناسی اور جودت طبع کا بڑا لطیف ہے ناظر صاحب علیہ الرحمہ (مولوی غلام بسم اللہ بسمل) کے عزیز جو معمولی تعلیم یافتہ تھے۔ مارہرہ سے دلی آئے اور اس تعلق سے کہ وہ ناظر صاحب کے عزیز ہیں۔ مرزا سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے اور اس واسطے سے اپنا تعارف کرایا ساتھ ہی کلام سنانے کی فرمائش کی مرزا بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ رسمی تواضع کے ساتھ ساتھ اپنا کلام سنا دیا۔

کچھ عرصے بعد ناظر صاحب کا دلی جانا ہوا۔ مرزا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ برسبیل تذکرہ مرزا نے کہا کہ آپ کے فلاں عزیز تشریف لائے تھے مجھ سے کلام سنانے کی فرمائش کی، میں نے تعمیل کر دی۔ بہت خوش ہوئے اور بہت داد دی۔

ناظر صاحب نے فرمایا کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ آپ نے بھی کس مسخرے کو کلام سنایا وہ کیا سمجھا ہوگا مرزا نے برجستہ کہا کہ بھائی مسخرہ وہ نہیں تم ہو۔ تم نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ میں نے کیا سنایا۔ جیاں میں نے انہیں

یہ کلام سنایا کہ ؎

وہ چرائے باغ میں میوہ جسے — پھاند جانا یاد ہو دیوار کا

واہ بے لڑکے پڑھی اچھی غزل — شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا

بیک نگاہ کسی کے متعلق ایسا صحیح اندازہ لگا لینا ذہانت و طباعی کا شاہکار ہے۔

نہ اس میں قوت تھی نہ مجھ میں

ایک واقعہ اور بھی سن لیجیے:

ایک بار ناظر صاحب تبدلی گئے۔ مرزا کے یہاں پہنچے تو مرزا اپنے ملازم دیرینہ کی تعزیت کے لیے جا رہے تھے ناظر صاحب کو دیکھ کر کہنے لگے کہ بڑے بر وقت آئے چلو میں اپنے ملازم کی بیوی کے پاس تعزیت کے لئے جا رہا ہوں۔ ناظر صاحب مرزا کے ہمراہ ہولیے۔ وہاں پہنچ کر مرزا نے مراسم تعزیت ادا کیے۔ اس کی بیوی نے رونا شروع کر دیا۔ مرزا جتنی دل جوئی کی گفتگو کرتے۔ وہ اور روتی۔ مرزا پریشان ہو گئے۔ آخر مرزا نے کہا کہ نیک بخت کیوں روتی ہو۔ جتنی عمر اس کی تھی اتنی میری ہے۔ نہ اس میں قوت باقی تھی نہ مجھ میں باقی ہے۔ جو اس کو دیتا تھا وہ تم کو دوں گا۔ جیسے تم اس کو سمجھتی تھیں ویسے تم مجھ کو سمجھنا۔ یہ سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ تم کو تو ہر موقعہ پر دل لگی آتی ہے اور مرزا اٹھ کر چل دیئے۔

بندی کو مولا نے کیا سرفراز

ایک اور لطیفہ مرزا کا ناظر صاحب نے بیان فرمایا کہ بھائی وہ تو اصلاح میں بھی گالیاں دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ ناظر صاحب نے قصہ حضرت بلال رضؓ نظم کیا اور بغرض اصلاح غالب کو بھیجا۔ ناظر صاحب خوش خط نہ تھے اور اس زمانے میں یائے معروف و مجہول کے استعمال میں لوگ محتاط بھی نہ تھے ناظر صاحب کا ایک مصرعہ تھا۔

بندے کو مولا نے کیا سرفراز

"بندے" یائے معروف سے تحریر تھا۔ مرزا نے اس کے املا کی تصحیح کرتے ہوئے لکھا کہ عیاذ باللہ آپ کا یہ عقیدہ ہے۔

ناظر صاحب نے کوئی لفظ لکھا تھا۔ مرزا نے اسے کاٹ کر کچھ بنا دیا۔ اتفاق کہ ناظر صاحب کو یاد نہ رہا اور پھر وہی لفظ استعمال کر لیا۔ مرزا نے اسے کاٹا اور نوٹ لکھا کہ ایک خطا دو خطا اور آگے ..... کی بجائے آخر تا بہ کجا خطا لکھ دیا۔

بیا برادر آور رے بھائی

نواب صدیق حسن خان قنوجی ثم بھوپالی[1] نے دہلی میں مفتی صدر الدین آزردہ سے تعلیم حاصل کی تھی اور انھوں نے اس دور کے نامور علما فضلا

---

[1] نواب صدیق حسن خاں کے حالات کے لیے دیکھیے تذکرہ علمائے ہند (رحمان علی) ترجمہ و مرتبہ محمد ایوب قادری (کراچی ۱۹۶۱ء)

ور شعراء و ادبا کو دیکھا تھا ان مجالس میں شریک ہوتے تھے ان کے فرزند اور سوانح نگار نواب علی حسن خاں نواب صدیق حسن خاں اور مرزا غالب کی ملاقات کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھتے ہیں[1]

"زمانۂ آغاز ملاقات میں والا جاہ (نواب صدیق حسن خاں) ایک بار مرزا غالب مرحوم کے دولت خانے پر خانۂ بے تکلف سمجھ کر بلا اطلاع سابق یکا یک پہنچ گئے اس وقت یاران رنگین طبع کی محفل گرم تھی مرزا نے ان کو دیکھ کر بے ساختہ یارانہ لہجے میں کہا۔

بیا برادر آ ذرے بھائی

اس وقت آپ کی کیا دعوت کروں۔ پہلے سے مجھ کو آپ کے آنے کا علم بھی نہ تھا۔ خیر بیٹھئے میں ضیافت طبع کیے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی جو انھیں دنوں میں شاہی دربار کی فرمائش سے لکھی تھی اس کا مطلع یہ ہے۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے   کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

والا جاہ اکثر اوقات کہا کرتے تھے کہ مرزا صاحب کا وہ دل آویز لب و لہجہ اور ان کے فصیح و بلیغ اشعار کی حسن ترتیب و ادا اور لطائف شعریہ اور جزالت معانی کی تاثیر کچھ ایسی دل میں پیوست ہو گئی ہے کہ جب کبھی اس کی یاد آتی ہے تو دل میں ایک عالم وجد و حال پیدا ہو جاتا ہے اور ہر وقت تازہ بتازہ نو بنو لطف حاصل ہوتا ہے۔

تازہ تر از تازہ ترے می رسد

---

[1] مآثر صدیقی (جلد دوم) نواب علی حسن خاں (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۴ء) ص ۱۵ - ۱۶

صفیر و غالب

مشفق خواجہ

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی سادات بلگرام میں سے تھے، ان کے بزرگ آرہ ضلع شاہ آباد (بہار) میں آباد ہو گئے تھے۔ والد کا نام سید ابوالحی عرف سید احمد تھا جو صاحب عالم مارہروی کے داماد تھے۔ صاحب عالم مارہرہ کے سجادہ نشین اور غالب کے دوستوں میں سے تھے۔ صفیر کی پیدائش اپنی ننھیال (مارہرہ) میں ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ (۷ اپریل ۱۸۳۴ء) کو ہوئی۔ تین برس کی عمر میں بلگرام گئے اور پانچویں برس آرہ میں اپنے باپ دادا کے پاس آ کر رہے۔ اٹھارہ برس کی عمر تک تعلیم حاصل کی۔ فارسی میں اعلیٰ استعداد بہم پہنچائی۔ خطاطی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ خط نستعلیق، نسخ، شفیعا، ثلث، اور غبار میں مہارت حاصل تھی۔ شاعری کا آغاز چودھویں برس میں ہوا۔ پہلے اپنے پھوپھا سید امداد مہدی جبیر سے اصلاح لی پھر لکھنؤ جا کر شیخ امان علی سحر کے شاگرد ہوئے۔ مرثیہ گوئی سے دلچسپی ہوئی تو مرزا دبیر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ آخر میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ صفیر نے ۱۲۶۴ سے ۱۲۷۰ ہجری تک کے بعد دیگرے کچھ تخلص (قطب، آثم، اثیم، صباد، نالان، احقر) اختیار کئے۔ آخر میں صفیر تخلص کیا۔

صفیر کا شمار اپنے عہد کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ اردو ادب کی تاریخ میں شاید پہلے شاعر ہیں جن کے تلامذہ کا تذکرہ (مرقع فیض مصنفہ سلطان مرزا، سلطان مطبوعہ ۱۲۹۵ھ) شایع ہو چکا ہے۔ اس میں اکسٹھ شاعروں کے حالات ہیں جن میں شاد عظیم آبادی اور خواجہ فخرالدین حسن خان سخن دہلوی جیسے ممتاز شعرا شامل ہیں۔ اس تذکرے کی اشاعت کے بعد بھی صفیر کے شاگردوں میں خاصا اضافہ ہوا۔

شاعری میں صفیر نے تقریباً تمام اصناف سخن غزل، مرثیہ، مثنوی اور رباعی وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔ نثر میں بھی ان کے کئی اہم کارنامے موجود ہیں جن میں "جلوۂ خضر" اور "رشحات صفیر" خاص شہرت رکھتے ہیں۔ صفیر کی تصانیف کی تعداد تقریباً پچاس ہے اور ان میں نصف کے قریب تصانیف ایسی ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوئیں۔[۱]

صفیر کا شمار غالب کے نامور تلامذہ میں ہوتا ہے، صفیر کو بھی اپنے استاد پر فخر و ناز تھا۔ اپنی تصانیف میں انھوں نے غالب کا

---

[۱] صفیر کے حالات اور تصانیف کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مرقع فیض، صفحہ ۶-۸۵- جلوۂ خضر، دوم صفحہ ۱۸۸، خود نوشت سوانح عمری، سہ ماہی اردو، جنوری، ۱۹۶۶ء -

ذکر نہایت عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ صفیر و غالب کے تعلقات کا آغاز ۱۲۸۰ ہجری سے ہوتا ہے جب کہ صفیر نے غالب سے شاگردی کی درخواست کی ۔ ۱۲۸۱ ہجری تک صفیر و غالب میں خط و کتابت رہی ۔ ۱۲۸۲ ہجری کے شروع میں صفیر دہلی گئے اور وہاں دو ڈھائی مہینے قیام کیا۔ اس مدت میں انہیں غالب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آیندہ سطور میں صفیر و غالب کے اسی تعلق کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

غالب و صفیر کی مراسلت

صفیر کے نام غالب کے تمام خطوط صفیر کی زندگی ہی میں شائع ہوئے ۔ پہلی مرتبہ "انشائے سبدگل" (۱۲۸۹ھ) میں اور دوسری مرتبہ "مرقع فیض" (۱۲۹۵ھ) میں اور تیسری مرتبہ "جلوۂ خضر" جلد دوم (۱۳۰۲ھ) میں۔ تینوں جگہ یہ خطوط مکمل صورت میں یا تمام خطوط کسی ایک کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ مذکورہ تینوں کتابوں کو پیش نظر رکھ کر مکاتیب غالب کے جو متون تیار کیے گئے ہیں، وہ ان متون سے مختلف ہیں، جو مختلف رسائل اور مجموعہ ہائے مکاتیب غالب میں شامل ہیں۔

"انشائے سبدگل" خطوط کا مجموعہ ہے، جسے صفیر کے شاگرد سید محمد ہاشم نے مرتب کیا۔ ۱۲۸۹ھ میں مطبع نورالانوار آرہ میں یہ مجموعہ چھپنا شروع ہوا لیکن چند جزو چھپنے کے بعد نامکمل رہ گیا۔ اس کے دیباچے میں مرتب نے لکھا ہے کہ یہ کتاب تین فصلوں اور ایک خاتمے پر مشتمل ہوگی ۔ پہلی فصل میں صفیر کے بزرگوں اور استادوں کے خطوط ہوں گے ۔ دوسری میں دوستوں اور تیسری میں شاگردوں کے۔ خاتمے میں ان لوگوں کے حالات ہوں گے جن کا ذکر ان خطوط میں آیا ہے، نیز ان لوگوں کا احوال ہوگا جن کے نام صفیر کے خطوط لکھے گئے۔ نامکمل انشائے سبدگل کا اب صرف ایک ہی نسخہ موجود ہے، اس کا کوئی دوسرا نسخہ کسی فرد کے پاس یا کسی کتب خانے میں نہیں ہے۔ یہ صفحہ اول سے صفحہ ۷۲ تک ہے اور درمیان میں سے سولہ صفحات یا تو موجود نہیں یا ہیں تو وہ سادہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اجزا ایک ہی طرف سے چھپ کر رہ گئے۔ پہلی دو فصلوں کے بیشتر خطوط ان صفحات میں آگئے ہیں، تیسری فصل صفحہ ۶۹ سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کے صرف تین صفحات موجود ہیں (صفحہ ۵۰ و صفحہ ۵۱ خالی ہیں) تیسری فصل چونکہ شاگردوں کے خطوط پر مشتمل ہے اس لئے ممکن ہے کہ شاگردوں کے نام صفیر کے خطوط اور ان کے جوابات فراہم نہ ہو سکے ہوں اور یوں یہ کتاب نامکمل رہ گئی ہو۔

"انشائے سبدگل" کی ترتیب و اشاعت میں خود صفیر بلگرامی کی کوششوں کو دخل تھا۔ وہ اپنے ایک شاگرد جوشش منیری کے نام لکھتے ہیں:

"... بالفعل رقعات خود کہ بنام احباب و بزرگان و اعزہ نوشتہ ام مع جواب آں کہ از طرف اینا آمدہ طبع می کنم۔ و اعانت آں از چند تلامذہ بندہ شدہ"۔ (مکتوب قلمی)[1]

---

[1] صفیر کے پوتے جناب سید وصی احمد بلگرامی کے پاس صفیر سے متعلق قلمی نوادر کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جن سے راقم نے استفادہ کیا ہے۔ اس مقالے میں جہاں کہیں کسی مخطوطے یا غیر مطبوعہ تحریر کا ذکر آیا ہے، وہ سید وصی احمد صاحب ہی کے پاس محفوظ ہے۔

جو شوخیٔ ہے اس کا جو جواب دیا وہ "مرقع فیض" میں چھپ چکا ہے اور اس میں "انشائے سبدگل" کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

"کچھ غزل و قطعہ و رباعی بذریعہ عریضہ کے ارسال کرتا ہوں امید ہے کہ پہلے اصلاح فرما کر جس قدر مناسب سمجھا جائے انشائے سبدگل فرمایا جائے۔" (مرقع فیض، صفحہ ۲۵) "انشائے سبدگل" کی پہلی فصل میں غالب کے خطوط مع جوابات موجود ہیں۔

"مرقع فیض" دوسری کتاب ہے جس میں خطوط غالب بنام صفیر ملتے ہیں یہ صفیر کے تلامذہ کا تذکرہ ہے، جسے صفیر کے شاگرد نواب تجمل حسین خان عرف سلطان مرزا سلطان نے لکھا تھا۔ یہ تذکرہ ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے خاتمے میں صفیر کے حالات ہیں۔ ان میں غالب کے خطوط بھی شامل کر دیئے گئے جن کی تمہید یہ ہے:

"... چونکہ آپ (صفیر) کے جوہر طبع کا فروغ اساتذہ پسند ہے، اس واسطے چند فقرات جو حضرت غالب دہلوی علیہ الرحمتہ آپ کی شان میں تحریر فرماتے ہیں بطور اسناد کے لکھے جاتے ہیں۔" (صفحہ ۸۲)

خطوط غالب کا تیسرا ماخذ "جلوۂ خضر" جلد دوم ہے۔ اس میں صفیر نے اپنے استادوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں غالب کا ذکر انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"... نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ غالب تخلص عرف مرزا نوشہ۔ میں نے حضرت غالب کی ملازمت و شاگردی کی کیفیت جلد اوّل تذکرہ ہذا صفحہ ۲۲۱ میں لکھ دی ہے اب دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ مگر اتنا لکھنا ضرور ہے کہ ۱۲۸۲ھ میں محرم کے آخری مہینے میں میں حضرت غالب کی ملازمت کے لئے دہلی گیا۔ اور دو ڈھائی مہینے حاضر رہ کر بہت کچھ فائدہ پایا۔ کچھ کیفیت اس کی جلد اوّل صفحہ مذکور میں لکھی ہے۔ اصلاح کی کیفیت یہ تھی کہ حضرت شاگرد کا کلام خود اپنی چشم مبارک سے دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے اصلاح دیتے تھے۔ چنانچہ رسالہ فیض صفیر جو تانیث و تذکیر کے باب میں ہے حضرت نے کئی روز دن میں خود اپنی آنکھ سے ملاحظہ فرمایا اور جا بجا اصلاح دی اور اس کی تقریظ لکھی جو عود ہندی میں چھپی ہے اور کلام فارسی و اردو میں اصلاح بھی اکثر ہوا کی ہے ...." (صفحہ ۲۱۶)

اس کے بعد صفیر نے اپنے اصلاح شدہ کلام کے ساتھ غالب کے خطوط بھی نقل کیے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے صفیر و غالب کے تعلقات کا آغاز ۱۲۸۰ھ میں ہوتا ہے جب کہ صفیر نے غالب سے شاگردی کی درخواست کی۔ ۱۲۸۰ھ میں صفیر اپنے نانا صاحب عالم مارہروی کے پاس مارہرہ میں مقیم تھے، وہیں سے انہوں نے غالب کو ایک خط (فارسی میں) لکھا جس پر صاحب عالم مارہروی اور شاہ عالم مارہروی کی سفارشی تحریریں تھیں۔ اس سے قبل کہ اس سلسلے کی تفصیل پیش کی جائے، یہ عرض کرنا ضروری ہے، کہ صفیر بلگرامی کا غالب کے نام، ایک اردو مکتوب بھی ملتا ہے جس میں

شاگرد بننے کی درخواست کی گئی ہے۔ یہ مکتوب "انشائے سبد گل" (صفحہ ۱۳) میں ہے اور اس کا متن یہ ہے:۔

مکتوب صفیر بنام غالب (۱) "جناب معلیٰ القاب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب نظام جنگ مدظلہ، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نبیرہ حضرت سید صاحب عالم صاحب و قبلہ مدظلہ کہ نادید اشتیاق حضوری اور آرزوئے قدم بوسی رکھتا ہے، بوسیلۂ تحریر بے تاثیر جناب نانا صاحب و قبلہ مدظلہ سلک شاگردان خاص میں منسلک ہوا چاہتا ہے۔ مجھے زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں کہ میرا وسیلہ بڑا ہے۔ ایک مخمس غزل قدسی کا نعت میں جو بالفعل کہا ہے، ملفوف ہے۔ والتسلیم۔"

اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب لکھا گیا۔ "انشائے سبد گل" میں خط کے بعد غالب کا جواب درج ہے۔ یہ "جوابی مکتوب" وہی ہے جو غالب نے مثنوی "صبح امید" پر اصلاح دینے کے بعد لکھا تھا۔ مرتب "انشائے سبد گل" نے کسی غلط فہمی کی وجہ سے غالب کے جواب کو مذکورہ مکتوب صفیر کا جواب سمجھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے صفیر کے مذکورہ بالا خط کا جواب نہیں دیا۔ اسی وجہ سے صفیر کو صاحب عالم اور شاہ عالم کی سفارش کی ضرورت محسوس ہوئی۔

صفیر نے مارہرہ سے غالب کے نام جو خط لکھا تھا وہ "جلوۂ خضر" (جلد دوم) میں شامل ہے اور اس کا متن یہ ہے:۔

مکتوب صفیر بنام غالب (۲) یزدان را از زبان بے زبانی سپاس گویم کہ آرزوی دیرینہ ما را بچہ عنوان بر آورد و مرا بعرض پابوسی بزرگان بسر در آورد۔ سما حضرت جناب نانا صاحب و قبلہ حضرت مولوی سید صاحب عالم صاحب دام ظلہٗ را جان داروی دل درد آشنا ساخت۔ و از قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد کہ از عظیم آباد پٹنہ شانزدہ کروہ سمت مغرب است و بزرگانم بعلۂ ریاست در آنجا طرح اقامت ریختہ اند تا قصبہ مارہرہ کہ مولدم و مسکن جدم است کشاں کشاں آورد۔

اے خدا قربان احسانت شوم ... این چہ احسان است قربانت شوم

در آب و گل این بیدل کہ نمک مذاق ریختہ اند و شور و سودا از سر برانگیختہ از بدو شعور ہم بارث آبائی و ہم بہنجار طبع آزمائی۔ با غزل سراشی سرے دارد۔ و نہا امکن انچہ از درو خزف می یابد از بحر خیال بیرون می آرد۔ اما این شاہدے است شوخ و شنگ کہ در کنار کساں بمشکل جا گرم می کند نہ کہ چون من ناکس ہوش در سر دارد۔ این ہم خوبی تقدیر اوست۔ چہ کند مجبور است کہ افسونے چند از کلام بزرگان خصوصاً جناب غالب معجز بیان یاد دارم۔ بہزار حیلہ تا لب آغوش بیان می آرم۔ زیادہ ازیں عرصہ مجال تنگ و حوصلہ فراغ ہنوز در کنار گرفتن باقی است۔ و حصول این مدعا دشوار تا کہ رشک نظیری و کلیم و غیرت صائب و سلیم، ظہوری ہنجار، نظامی کردار، مطلوب ہر طالب جناب نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ متخلص بہ غالب دام ظلہٗ افسون تازہ نہ بر انگیزد و بہ رہنمائی این نابلد کوچۂ خوش کلامی بندہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نہ برخیزد۔ اگرچہ جائی آن بود کہ سر از منصب پا دادہ و پا بر روش استعمال نہادہ بدہلی رسیدمے و از گلزار زیارت

حضرت غالب علی کل غالب گل نظارہ بر چیدمے۔ و نالہ ہائی چندکہ از دل غم پیوند سرزدہ اند بگوش حق نیوش رسانیدمے و از خوبی قسمت دیدمے اگر دیدمے، اما قدم کل امر مرہون باوقاتہا چنانم زبستہ کہ این راہ بدو دیم کشاید۔ کام بخش جہانیان، من ناکام را روزی و نصیب فرماید۔ حالا بوسیلۂ دو بزرگان باطناً خود را بحضور عالی می رسانم۔ یکے نانا صاحب دوم جناب فرخ فال حضرت شاہ عالم صاحب، بوکہ نظر توجہ دریغ نہ فرمود؛

از بزرگان کارہا دشوار نیست

و بنا بر اظہار بے استطاعتی خود غزلے چند فارسی و اردو می رسد۔ باممعان نظر دیدہ این انگارہ را از رنگ اصلاح جلوہ تازہ دادہ شود، و بعد ازین نام این گمنام در زمرہ مستفیدان نگاشتہ آید کہ سر افتخارم بر فلک ساید۔ فقط و پرسیدنی ہم دارم و آں لفظ پرستان است۔ بعضے گویند کہ این لفظ ہندی است یعنی استہان جہ استہان مقام را گویند۔ و بعضے بر آیند کہ استہان ہندی و پری فارسی ترکیب آں چگونہ واقع است۔ در اصل پریستان است۔ یائی پری تخفیف کردہ شد و پائے پری راکسرہ دادہ پرستان کردند۔ حالا از جناب اصل حقیقت می پرسم۔" (صفحہ ۲۱۶-۱۷)

اس خط پر صاحب عالم مارہروی نے مندرجہ ذیل سفارشی سطور تحریر کیں:

صاحب عالم غفرالله الاعظم سلام و دعاہا و آرزو مندیہائے بے حدو انتہا می رساند و این دو بیت عالیہ می خواند:

اے لعل ز اشعار تو شرمندہ گہر ہم
مشتاق تو ارباب دول اہل ہنر ہم
لخت جگرم را کہ صغیر است تخلص
خواہد ز تو فیض سخن آں لخت جگر ہم

والسلام ــــ [1]

---

[1] یہ خط بھی جلوۂ خضر (جلد دوم صفحہ ۹۰، ۴۸) میں ہے۔ لفظ "والسلام" جلوۂ خضر میں نہیں بلکہ خط کے اصل مسودے سے لیا گیا ہے جو سید وصی احمد صاحب بلگرامی کے پاس محفوظ ہے۔ یہ ۱۳ × ۹" تقطیع کا کاغذ ہے جس کی ایک طرف صغیر کا خط ہے۔ خط کے دائیں حاشیے پر صاحب عالم کا اور بائیں حاشیے پر شاہ عالم صاحب کی تحریریں ہیں۔ صغیر نے شاہ عالم کی تحریر جلوۂ خضر میں نقل نہیں کی۔ یہ پہلی مرتبہ یہاں شائع ہو رہی ہے۔ اسی خط کے مسودے کی دوسری طرف صغیر کا کلام ہے۔ غالب نے اسی پر اصلاح دے کر یہ کاغذ صغیر کو واپس کر دیا۔ صاحب عالم مارہروی کا خط عبدالغفور سرور کے قلم سے ہے کیونکہ وہ رعشہ کی وجہ سے اپنے خطوط سرور سے لکھواتے تھے اور صرف دستخط کر دیتے تھے۔ اس طرح اس نادر دستاویز پر پانچ اہل علم (غالب، صاحب عالم، شاہ عالم، سرور اور صغیر) کی تحریریں موجود ہیں۔

شاہ عالم نے مندرجہ ذیل سفارشی الفاظ لکھے:

"........ بلے عجیب[1]

مابندہ لطف تو و احسان تو

بحضور شفقت گنجور جناب مرزا صاحب قبلہ و کعبہ محمد اسد اللہ خان صاحب مدظلہٗ العالی بندہ شاہ عالم غفراللہ الاعظم کہ نیازمند قدیم ہے بعد گزارش تسلیم و بندگی . . . عزیز و ہمشیرزادہ بندہ سید فرزند احمد صاحب متخلص بہ صفیر کہ فی الحال بہ تقریب ملازمت حضرت والا ماجد مدظلہ العالی وارد مارہرہ ہیں، اشتیاق قدم بوس جناب بہت رکھتے ہیں اور جو محبت اور اخلاص آپ کا نسبت نانا صاحب کے اور عطوفت روز افزوں جناب کی اور پر حال میرے کے یوماً فیوماً زیادہ جانتے ہیں . . . ہم بھی وابستگان دامن محبت جناب . . . . امید ہے کہ حضور پر نور بنظر کیمیا اثر سے ملاحظہ فرما کے حک و اصلاح سے کلام عزیز مذکور درست فرمادیں. . . . ."

صفیر نے اپنے مکتوب کے ساتھ غالب کو ایک فارسی دو غزلہ اور اردو کی دو غزلیں ارسال کی تھیں۔ غالب نے صفیر کے فارسی خط اور فارسی غزلوں پر اصلاح دی۔ فارسی خط پر جو اصلاح دی، وہ خط پر بھی درج کی اور اپنے مکتوب میں اس کی تفصیل بھی لکھی۔ اشعار پر جو اصلاحیں دیں وہ یہ ہیں:

۱۔　خیال روئے تو اے قبلۂ نظر کردم
　　ز دیدہ تہمت نظر خویش بہرہ ور کردم

اس شعر کا پہلا مصرع یوں بنا دیا:　خیال روئے ترا قبلۂ نظر کردم

۲۔　بلند شد شب ہجراں چو شعلۂ آہم
　　چراغ ماہ خمش گشتہ بود بر کردم

دوسرے مصرعے کی اصلاحی صورت یہ ہو گئی۔ "چراغ مہ بہ فلک مردہ بود بر کردم"

۳۔ مندرجہ ذیل تین اشعار غالب نے قلم زد کر دیئے۔ یہ شعر صفیر نے "جلوۂ خضر" میں درج نہیں کئے، مذکورہ شدہ مکتوب سے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

خوش است جامہ دریدن و دیدن صحرا
ز فیض دست جنوں کسب این ہنر کردم

خضر مصاحبتم در سفر تمنا داشت
ولے نہ با خودشش از رشک ہم سفر کردم

---

[1] اس اقتباس میں یہاں کہیں نقطے لگائے گئے ہیں، وہاں سے اصل مکتوب کرم خوردہ ہے

بجائے خود بنشیں، پا منہ بجائے دگر

بیا کہ جائے تو دل کردم و جگر کردم

صفیر نے دونوں غزلوں کے مقطعوں میں غالب کا ذکر کیا ہے:

برائے حضرت غالب زفرط شوق صفیر

ترانۂ غزل شایقانہ سر کردم

زطور مشعل اشعار غالبؔ است صفیر

چراغ این غزل فارسی کہ بر کردم

اردو کی جو دو غزلیں صفیرؔ نے غالب کو بھیجی تھیں، ان میں سے ایک جس کا مطلع یہ ہے

اے فلک روز جو پیچان ہیں ہم

کیا خم کاکل خوبان ہیں ہم

صفیر نے جلوۂ خضر میں درج کی ہے، لیکن دوسری غزل درج نہیں کی جس کا مطلع یہ ہے:

زلف کو ہم بلا سمجھتے ہیں

پیچ کی بات کیا سمجھتے ہیں

یہ دونوں غزلیں پانچ پانچ شعروں کی ہیں۔

اصلاحوں کے ساتھ غالب نے صفیر کے خط کا جو جواب لکھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ خط پہلی مرتبہ مرقع فیض (صفحہ ۸۲) میں چھپا اور دوسری مرتبہ جلوۂ خضر، جلد دوم (صفحہ ۲۱۲ - ۲۲۰) میں۔

مکتوب غالب (۱)

مخدوم مکرم سید فرزند احمد صاحب کو سلام پہنچے، مجھ کو حضرت پیر جبیں فطرت جناب حضرت صاحب عالم صاحب سے نسبت اویسی ہے، غائبانہ حاضر کی فہرست میں پہلے میرا نام مرقوم ہے، آپ کی طرز نگارش نظماً و نثراً درخشندگی جو ہر طبع سے خبر دیتی ہے اگر آپ کی طرف سے استعلام کا کلمہ درمیان نہ آتا تو میں فضولی نہ کرتا، باوجود خواہش خدمت کیوں نہ بجالاؤں؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری معلومات آپ پر مجہول نہ رہیں [۱] مجموع ایک ورق میں کیوں کر گنجائش پائیں۔ ناگزیر جو اس نظم و نثر میں ہے اس کو عرض کرتا ہوں۔

"بسر ورد آوردن" محل معنی "در آوردن" کافی" شور در سر انگیختن" "ٹکسال باہر" "از سر انگیختن" مناسب۔ "نہ برانگیزد" و "نہ برخیزد" فارسی ہند۔ "بر دخیزد" و "برنگیزد" فارسی عجم۔ "بر" لفظ زاید اور نون مفید معنی نفی۔ لفظ زاید "نا" قبل

---

[۱] مرقع فیض میں یہ خط صرف یہیں تک نقل کیا گیا ہے۔

کلمہ چاہیئے " نالہ ہا کز دل سر بر زدہ اند " یعنی چہ ؟ غیر ذوی الروح بلکہ غیر ذوی العقول کی جمع کی خبر بہ صیغۂ مفرد رسم ہے۔

"پریستان" اصل لغت، مخفف اس کا بہ حذف تحتانی "پرستان" پری استان توہم محض، مگر یہ بھی یاد رہے کہ کلام الشعراء ہندوگی (کذا) سے فخر المتاخرین شیخ علی حزیں تک کسی کے کلام میں "پریستان" یا "پرستان" دیکھا نہیں۔

حضرت صاحب عالم قبلہ کی جناب میں میرا سلام عرض کیجئے اور کہئے کہ آپ کا عطوفت نامہ اور ساتھ اس کے چودھری صاحب کا مودت نامہ پہونچا، دونوں نگارشیں جواب طلب نہ تھیں۔ کل میں نے ایک چھاپے کی کتاب کا پارسل جس کا عنوان سید فرزند احمد صاحب کے نام کا ہے ارسال کیا ہے۔ آپ بھی بہ نظر اصلاح مشاہدہ کیجئے گا۔

ہاں اے پیرو مرشد! فارسی کے کلیات کو بھی کبھی آپ دیکھتے ہیں یا نہیں۔ بقول انشاء اللہ خان :-

یہ میری عمر بھر کی پونجی ہے

جناب سید فرزند احمد صاحب سے التماس ہے کہ حضرت صاحب کو سلام و پیام پہونچا کر حضرت شاہ عالم صاحب کو اور ان کے اخوان کو اور حضرت مقبول عالم کو میرا سلام کہئے گا اور جناب چودھری عبدالغفور صاحب کو سلام کہہ کر یہ فرمایئے گا کہ وہ اپنے عم نامدار میں اور استاد علی مقدار کو میرا سلام کہیں۔ زحمت تبلیغ سلام و پیام تقدیم خدمت اصلاح کا دست مزد ہے۔ والسلام

نجات کا طالب

غالب

یوم الخمیس ذی الحجہ و ۱۲ رمئی، سال حال

جلوۂ خضر میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ خط دہم ذی الحجہ، ۱۲۸۰ ہجری یوم سہ شنبہ کو مارہرہ میں صفیر کو ملا۔ تقویم کے مطابق عیسوی تاریخ ۱۷ رمئی، ۱۸۶۴ء) گویا غالب نے یہ خط ۱۲ رمئی ۱۸۶۴ء مطابق ۵ ر ذی الحجہ، ۱۲۸۰ ہجری کو لکھا۔ مولانا مہر نے خطوط غالب (صفحہ ۷۵۸) میں اس کی تاریخ ۱۲ ر ذی الحجہ درج کی ہے، جو درست نہیں۔

غالبؔ نے مذکورہ خط ارسال کرنے سے ایک روز قبل ایک مطبوعہ کتاب کا پارسل بھی صفیر کے نام بھیجا تھا۔ یہ مطبوعہ کتاب مثنوی ابر گہر بار تھی جو صفیرؔ کو غالب کے خط سے قبل ملی۔ صفیرؔ نے اس تحفے کی وصولی پر شکریہ کے طور پر "صبح امید" کے نام سے ایک مثنوی لکھی، یہ مثنوی "جلوۂ خضر" (جلد دوم صفحات ۲۴ تا ۲۲۱) میں شامل ہے اور اس مقالے میں درج کی جا رہی ہے۔ اس مثنوی کی جو نقل صفیرؔ کے ذاتی کاغذات میں محفوظ ہے، اس میں اور مطبوعہ مثنوی میں خاصا فرق ہے۔ حواشی میں اس فرق کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ یہ مثنوی غالب نے بعد اصلاح صفیرؔ کو واپس کر دی۔ غالب کی اصلاحیں بھی حواشی میں درج کر دی گئی ہیں۔ "جلوۂ خضر" میں مثنوی اس عنوان کے تحت درج کی گئی ہے۔ "مثنوی صبح امید بندہ صفیر شکریہ ورود مثنوی ابر گہر بار حضرت غالب"۔ قلمی مسودے میں عبارتِ آغاز یہ ہے:

"مثنوی صبح امید در شکریہ عنایت مثنوی ابر گہر بار کہ مرزا اسد اللہ خان غالب از دہلی بہ بندہ فرزند احمد صفیر بلگرامی برڈاک روانہ فرمودہ بمقام: مارہرہ ضلع ایٹہ، بتاریخ ہشتم ذی الحجہ، ۱۲۸۰ھ، گفتہ شد"۔ مثنوی کے اختتام پر یہ عبارت ہے،

"بفکر دو ساعت از نصف النہار بمقام مارہرہ بتاریخ ہشتم ذی الحجہ روز یک شنبہ، ۱۲۸۰ ہجری"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی غالب کے مذکورہ خط سے (جو ۱۰ ذی الحجہ کو موصول ہوا تھا) دو روز قبل ملی تھی اور صفیر نے اسی روز "صبح امید" لکھی۔ صفیر نے "صبح امید" غالب کو بھیجی تو اس کے ساتھ مندرجہ ذیل خط بھی تھا۔ یہ خط "انشائے سبد گل" (صفحہ ۱۴) میں شامل ہے

مکتوب صفیر (۳) جو شکر کہ کبھی ادا نہ ہو سکے اور جو فخر کہ ذرہ کو آفتاب تک پہنچا دے، میرے لئے اسی کی ضرورت ہے اور اسی کی صورت ہے یعنی آج حضرت عالی مرتبت مرزا اسد اللہ خان صاحب غالب تخلص کا سرفراز نامہ معہ خریطہ مثنوی ابر گہر بار ہدیتاً مجھ کو پہنچا اور نامۂ عنبریں شمامہ سے ظاہر ہوا کہ مجھے بڑے وسیلے کے سبب اپنی شاگردی میں قبول فرمایا

یوں گرد اپنے آپ پھروں فخر سے صفیرؔ
شاگرد مجھکو غالبؔ ذی جاہ نے کیا

خدایا مجھے وہ زبان دے جو اس کا شکر ادا کر سکے، بالفعل زبان خامہ سے کام لوں اور ایک مثنوی شکریہ میں "صبح امید" نام کہہ کر بھیجوں۔ لو صفیر تائید غیبی ہوئی۔ دو گھنٹے میں مثنوی لکھی گئی۔ اب جلد لفافہ کر کے دہلی کو روانہ کرو"

اس مکتوب سے پہلے "انشائے سبد گل" میں مندرجہ ذیل تمہیدی عبارت لکھی گئی ہے۔

"جواب الجواب از طرف حضرت استادی مع شکریہ مثنوی ابر گہر بار موسوم بہ مثنوی "صبح امید" کہ سابق در مطبع بابو سفت پرشاد صاحب طبع شد۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی "جلوۂ خضر" میں شامل ہونے سے پہلے علاحدہ طور پر بھی چھپ چکی ہے۔ یہ مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہے۔

مثنوی "صبح امید" کا متن یہ ہے:

مثنوی "صبح امید"

زہے جلوہ زار صباح امید — کہ بہر من از شرق دہلی دمید[1]
چہ صبحے کہ صبح بنا گوش حور — کند از تجلی او کسب نور
صباحے کہ می تابد از باب دل — شب او شہ قدر ارباب دل

---

[1] زہے نور پاشی صبح امید کہ بر من ز دہلی افق بر دمید (مسودۂ صفیر)

صبائے کہ مست وی اند اہل ہوش　　بدنبال او خور صبوحی بدوش[1]

صباحے کہ زو گشت ہشیار مست　　مکان مست در مست دیوار مست

چو بر تافت از شرق این صبح نور　　پدیدار شد پیک فرخ چو ہور

بہ تارک چو خورشید تاج زرش　　بہر در جنائے ضیا گسترش

زنار شعاعی کمر بند او　　چو صبح تمنا شکر خند او

خرامندہ چون ساقی نیم مست　　چو جام میم داد ابرے بدست

چہ ابرے کہ نامش گہر بار شد　　چہ گوہر کہ انجم از و خوار شد

چہ ابرے کہ بارد بکشت امید　　ترو تازہ از وے بہشت امید

چہ ابرے کہ چون زلف شکیں پرند　　چو قطرات در وے دل خلق بند

چہ ابرے کہ از وے شب زلف ماہ[2]　　ز صبح بناگوش شد پردہ خواہ[3]

چہ ابرے کہ در صورت آئینہ سال　　وے پیکر خویش بمعنی نہال

چہ ابرے کہ ظاہر چو اوراق نور　　بباطن ہمہ مصحف روئے حور

بیا و ببیں در نورد ورق　　روان آب حیوان چو بر رو طرق

سوادش سواد دو چشم پری　　صفا ریز در پردۂ عبہری

بیاضش بیاض گلوئے بتاں　　بشیرازہ در تار موی بتاں[4]

بر اوراق صافش سواد سطور　　بر آوردہ عنبر ز دریائے نور

نگارین کتابے چو اوراق گل　　بظاہر چو جزوے بباطن چو کل

زہے بخت فرزند احمد صغیر　　شد از نیر سعد نیرو پذیر

زہے قوت طالع غالبش[5]　　کہ آمد چنیں تحفہ از غالبش

---

[1] "بدنبال او خور صبوحی فروش" (اصلاح غالب)

[2] "چہ ابرے کزو در رو زگیسو سیاہ" (اصلاح غالب)

[3] "ز صبح بناگوش شد باج خواہ" (اصلاح غالب)

[4] "تاب در بتا بے چو روئے بتان" (مسودہ صغیر)

[5] "زہے طالع فرخ غالبش" (مسودہ صغیر)

چہ غالبؔ کہ غالب بود از ازل — بنظم قصید بفکر غـزل
دبیر فلک مرتبت نجم نر — زطبعش نظام سخن بہرہ ور
چہ شیرے کہ نامش نگنجد عیان — بہ بیدائی دور دور از بیان[1]
بباطن چو پرسی بگوئیم نام — اسد خود بہ اللہ قربش مدام
کلیم سخنور سر آستان — عصا در کف از کلک گوہر فشان
فغانی کہ جادو بیانی کند — سر کوئے او پاسبانی کند
ہلالی روان و دوان در رکاب — دل فیضی از طبع او فیض یاب
نظامی پے نظم ملک سخن — بود پیشکارش بہر علم و فن
بجامی سپردست مے خانہ را — کہ ناظر بود دور پیمانہ را
سرجا کرانش کہ خسرو بود — شب و روز اندر تگ و دو بود
ز فردوسی اینک چہ جوی نشان — بہ گلزار فکرش بود باغبان
ہم اودا سزد این سخن گستری — کہ دارد بہرہ تمنا ساوری
کلام مبنیش کشود است دل — زنازک خیالان ربود است دل
گران سنگی نغمہ ہائی سبک — ز سنگیں دلان ہمچو ظرف تنک
برآورد سرا کہ غوغا فتد — بجان آتش سنگ خارا فتد
من و وصف او اے عجب اے عجب — مگر ہم زقولش دہم زیب لب
نویسد ہم او در ہمان مثنوی[2] — بہنجار جادو بیان قوی[3]

اشعار مثنوی ابر گہربار غالب

سخن را خود آنگونہ دانم سرود — کزین نیز خوشتر توانم سرود
چہ غم گر فلک رنگم از روی برد — توانم زخود در سخن گوی برد

---

[1] "بہ بیدائی وزن کارآگہان" (مسودہ منیر)

[2] "سراید ہم او در ہمان مثنوی" (مسودہ منیر)

[3] زمانش بہ از منطق پہلوی (اصلاح غالب)

نہ نالم ز پیری، جوانم بہ رائے — ہنوزم بود طبع زور آزمائے

سخن سنج معنی طرازم ہنوز — بشیوائی شیوہ نازم ہنوز

بہر بذلہ کز لب نشانم چو تند — خضر ورد من فال گوید بلند

بہ بستان زنی خامہ منقار من — ہمہ در خون مرغ گل از خار من

توانم کہ در کارگاہ ہنر — بہ نیروی یزدان پیروز گر

زہم بگسلم پاستانی طراز — سخن را دہم جاودانی طراز

گزشت آنکہ دستان سرائے کہن — ز کیخسرو و رستم آرد سخن

منم کم بود در طراز کلام — شہنشہ، پیمبر، سپہبد، امام

ز فرد و سیم نکتہ انگیز تر — ز مرغ سحر خوان سحر خیز تر

اگر جائے دستان سرائی بدے — رہ و رسم جادو نوائی بدے

زبان را برامش گرد کردمے — دم جنبش زخمہ نو کردمے

ہم زخمہ از دیگران تیز تر — ہم ساز وانش نوا خیز تر

بہ آزادگی خسروی می کنم — بدین پشت وانش قوی می کنم

نباشد اگر پائے دیں درمیان — نہم ہفت خوان بلکہ ہفتاد خوان

ہمم از تو برتر ببال گزاف — تو سیمرغ آری و من کوہ قاف

تو سوسن فرستی بخنیاگری — مرا جنبش کلک رقص پری

بازگشت خامہ بسوئے مدعا

چو خود گفت و در سفت پایان کار — چہ آید ز من مدح شایان کار[1]

زدریوزہ اش انچہ من یافتم — فشاندم بپایش چو در یافتم

چہ خوش گر ز ورد کلام خوشش — ہم از بردن حرف نام خوشش

بیانم چہ داد معانی دہد — زبانم گرہ عقد اللسانی دہد[2]

---

[1] "چہ آید ز من حرف شایان کار" (مسودہ صفیر) اس کے بعد ایک شعر مسودے میں اضافہ ہے:

زگفتار اویم ستائش گرش — ز اشعار اویم ستائش گرش

[2] بہ ہمنام او صد مدد از احد (مسودہ صفیر)

کہ نامش ہزاران اثر می دہد — زہمنام اویم خبر می دہد

زہے قوت بخت سعد و نکو[1] — عدد یا بم از بردن نام او

زہمنام خویش است اورا مدد — بہم نام او صد مدد از صمد

چہ ہمنام امام طریق ہدیٰ — اخ مصطفےٰ، باب علم خدا

حنا بند دست مطالب ہم اوست — کہ غالب علی کل غالبہم اوست

خدا یا ز دیدار او شاد کن — دو چشم مرا حیرت آباد کن

چو این لطف عام کہ خاصم شدہ است — دلیل رہ اختصاصم شدہ است

فرستم ازین جا بآں صد ثنا — دعائے فراوان و بے حد ثنا[2]

ز بہر من از داور داد گر — رسید این سعادت بہ مارہرہ در

چہ مارہرہ رشک بہشت برین — نیاکان مارا مقام گزین[3]

بزرگے کہ من نبیسۂ او ستم — بود فخر دوران بیزدان قسم[4]

بعلم و بعقل و بہ ہمت بلند[5] — رسد بر سر عرش او را کمند

براسم و علم صاحب عالم است — متاش ہم صاحب عالم است[6]

ورا فخر اقران و امثال جیش — بہیں یادگار بزرگان خویش[7]

و بیرے پدر گاہ او در تیر چرخ — مریدان او جملہ تا پیر چرخ[8]

ز غالب بود ہر زمان نظم جو — کہ ہم ہی او ہست و ہم عمر او

---

[1] خوشا من خوشا بخت سعد و نکو (مسودہ صفیر).

[2] زمن صد دعا و زمن صد ثنا — دعا بلکہ بسیار و بے حد ثنا (مسودہ صفیر)

[3] بزرگان مارا اقامت گزین (مسودہ صفیر)

[4] ز خاصان بود ہم بہ یزدان قسم (مسودہ صفیر)

[5] بعلم و بدانش چو ہمت بلند (مسودہ صفیر)

[6] ہمانا کہ او صاحب عالم است — و لے نام او صاحب عالم است (مسودہ صفیر)

[7] ز صاحب دلان او بہ سی دہ در — بود یادگار بزرگان بفر (مسودہ صفیر)

[8] نگارندۂ پایۂ اش پیر چرخ — یکے از مریدان او تیر چرخ (مسودہ صفیر)

اس کے بعد یہ دو شعر زائد ہیں:

توجہ بہ ارباب فن بیشتر — توغل بہ شعر و سخن بیشتر

خدایا بود ظل او بر سرم — بحق نبیؐ و علیؑ از کرم

نبشتم بشکریہ این شعر چند　　صفیر از من این وز غالب پسند[1]

مثنوی پر اصلاح بھیجنے کے ساتھ غالب نے ایک خط لکھا جو پہلی مرتبہ مکمل صورت میں "انشائے سبد گل" (صفحہ ... میں شامل ہوا - دوسری مرتبہ "مرقع فیض" میں (صفحہ ۸۳-۸۲) میں نامکمل صورت میں طبع ہوا - تیسری مرتبہ "جلوۂ خضر" (دوم، صفحہ ۲۲۳) میں چھپا اور اس میں بھی نامکمل تھا - "مرقع فیض" میں یہ خط "... مثنوی نہست میں چاہیئے" تک ہے - اور پھر نیاز کا طالب، غالب - ۱۲ - یوم الخمیس پنجم ذی الحجہ، ۱۲۸۵ ہجری" کے الفاظ درج کئے گئے ہیں - "جلوۂ خضر" میں "... یہ ریاضت کہاں" تک کی عبارت درج کرنے کے بعد "۱۲ غالب" کے الفاظ بڑھا کر یہ خط ختم کر دیا گیا -

"انشائے سبد گل" اور "جلوۂ خضر" میں تاریخ نہیں لکھی گئی - "مرقع فیض" میں تاریخ اور سنہ دونوں صریحاً غلط ہیں - یہ خط مثنوی "صبح امید" کی اصلاح کے ساتھ آیا تھا - مثنوی ۸ ذی الحجہ کو بھیجی گئی تھی، اگر یہ دوسرے دن (۹ ذی الحجہ) کو ڈاک کے حوالے کی گئی ہو تو غالب کو چوتھے یا پانچویں روز (۱۲ یا ۱۳ ذی الحجہ) ملی ہوگی - یہ خط اسی مہینے میں ۱۳ یا ۱۴ ذی الحجہ کے بعد کی جمعرات کے دن لکھا گیا ہے - تقویم کی مطابق ۱۲۸۰ ھ میں ۱۹ یا ۲۶ ذی الحجہ کو جمعرات کا دن پڑتا ہے - اس لئے یہ خط انہیں دو تاریخوں میں سے کسی ایک میں غالب نے لکھا ہوگا - "مرقع فیض" میں ۱۲۸۵ ہجری صریحاً غلط ہے - اس لئے کہ ۱۲۸۵ ہجری کے ذی الحجہ کے مہینے میں غالب اس دنیا میں موجود ہی نہیں تھے - شاید اسی خیال کے پیش نظر ڈاکٹر مختار الدین احمد نے جب اس خط کو چھپوایا تو اس کے ساتھ ۱۲۷۸ ہجری درج کر دیا - [2] لیکن یہ سنہ بھی غلط ہے - جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، یہ تمام خط و کتابت ۱۲۸۰ ہجری کی ہے - غالب کا خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے - "انشائے سبد گل" "مرقع فیض" اور "جلوۂ خضر" میں اس خط کے متن میں کہیں کہیں لفظی اختلافات ہیں، حواشی میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے -

مکتوب غالب (۳)

مخدوم زادہ مرتضوی دودمان سعادت و اقبال توامان مولوی سید فرزند احمد صاحب کو فقیر غالب کی دعا پہنچے - میں نے جو استصلاح اشعار میں امتثال امر کیا ہے تو اس واقعہ کو سمجھ لیا ہے کہ میں جناب[3] امیر المومنین کا بوڑھا غلام ہوں - امیر نے اپنی اولاد میں سے ایک صاحب زادہ میرے سپرد کیا اور حکم دیا ہے [4] کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر، ورنہ میں کہاں اور یہ ریاضت کہاں -

اپنے نانا صاحب کی خدمت میں میری بندگی عرض کیجئے گا اگرچہ حضرت میرے ہم عمر ہیں مگر ان کے ابا و اجداد کا غلام ہوں

---

[1] الہی محمود غالبم سالہا پسند

[2] "نگار" لکھنؤ بابت جولائی ۱۹۵۲ء، مقالہ "غالب کے چند نایاب خطوط" صفحہ ۳۴۶

[3] لفظ "جناب" "مرقع فیض" میں ہے "جلوۂ خضر" میں نہیں ہے -

[4] الفاظ "اور حکم دیا ہے" "جلوۂ خضر" میں نہیں ہے

سلام کیا لکھوں، مجھ کو ارادت میں ان سے نسبت اویسی ہے اور محبت بھی بے تکلف ویسی ہے جیسی اس معنوی نسبت میں چاہیئے۔"

جناب صاحب زادہ ہائے مرتضوی گہر حضرت سید عالم صاحب اور شاہ عالم صاحب اور مقبول عالم صاحب اور خورشید عالم صاحب کو دعائے درویشانہ اور سلام ہائے مسنون۔ حضرت رفعت درجات مولوی سید محمد امیر صاحب کی جناب میں بعد ... بلیہ نیاز کے معروض ہے کہ حرف پوزائے ہوز بے تمک زباں۔ ۔ ۔ ۔ [۱] لغات عربی میں اس کا نشان پایا جانا از روئے ... [۲] ہوگا۔ ہر چند زبان عجم میں اشتراک نادر ہے مگر۔ ۔ ۔ [۳] نہیں جیسا کہ ... [۴] شترک ... [۵] ہے۔ غالب"

۱۲۸۱ ہجری میں صفیر نے "بوستان خیال" کے ترجمے "پرستان خیال" کی پہلی دو جلدیں شائع کیں۔ غالب کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے صفیر کو ایک خط لکھ کر یہ کتاب طلب کی۔ یہ خط پہلی مرتبہ "انشائے سبد گل" (صفحہ ۱۴) میں چھپا۔ بعد میں یہ "فیض صفیر" (صفحہ ۸۲) میں شامل کیا گیا۔ اس میں "بالغ نظران چند پر عموماً" کے بعد "غالب۔ ۸ ذی قعدہ ۱۲۸۱ ہجری" لکھ کر خط ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کی عبارت "مرقع فیض" میں نہیں ہے۔ "جلوہ خضر" (جلد دوم صفحہ ۲۲۳) میں بھی یہ خط شامل کیا گیا ہے۔ "جلوۂ خضر" میں بعض جگہ لفظی اختلاف ہے، ذیل میں یہ خط درج کیا جاتا ہے، حواشی میں اختلافات کی صراحت کی گئی ہے۔

مکتوب غالب (۴) "نور نظر[۱] لخت جگر، زبدہ اولاد پیغمبر مولوی سید فرزند احمد[۲] زاد مجدہ، اس درویش گوشہ نشین کی دعا قبول فرمائیں۔ "بوستان خیال" کے ترجمے کا عزم اور دو جلدوں

---

(۱) ایک لفظ کرم خوردہ
(۲) چند لفظ کرم خوردہ
(۳) چند لفظ کرم خوردہ
(۴) دو لفظ کرم خوردہ
(۵) چند لفظ کرم خوردہ
(۶) دو لفظ کرم خوردہ
(۷) جلوہ خضر میں "نور چشم" ہے۔
(۸) جلوہ خضر میں "احمد" کے بعد "صاحب" کا صغیر ہے۔

کا منطبع ہو جانا مبارک۔ حضرت یہ آپ کا احسان عظیم ہے، مجھ پر خصوصاً اور جمیع[1] بالغ نظران ہند پر عموماً۔۔۔ (کذا)[2]
جناب میر ولایت علی صاحب سے بعد ارسال قیمت و محصول دو جلدیں مانگی ہیں، خدا کرے وہ پارسل پہلے بھیجیں اور یہ رقعہ سگ تمہارے پاس بعد۔ (مہر غالب ۱۲۷۸ھ) ۸ ذی القعدہ ۱۲۸۱ ہجری"۔

صفیرؔ نے غالب کے مذکورہ خط کا مندرجہ ذیل جواب دیا۔ یہ خط "انشائے سبد گل" (صفحات ۱۸-۱۵) میں شامل ہے۔

مکتوب صفیر (۴)

حضرت عالی مرتبت فخر المتقدمین، استاد المتاخرین جناب معلیٰ القاب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان صاحب بہادر نظام جنگ مدظلہ العالی۔ صفیر ژولیدہ تقریر کی تسلیم نیاز بے انداز کے ساتھ قبول ہو۔ نوازش نامہ بطلب جلد مطبوعہ "پرستان خیال" بنام میر ولایت علی صاحب اور میرے مشعر اشتیاق ملا ایطاق ورود پایا۔ جو فقرہ کہ حضور نے نادیدہ "پرستان خیال"[3] کی تعریف میں لکھا ہے میرے افتخار اور استظہار کا باعث ہوا۔ خداوند تعالیٰ سلامت رکھے اور ہم شاگردان ہیچمدان ہمیشہ فیض یاب رہا کریں۔۔۔[4] روانہ ہوتے ہیں، پہنچیں گے۔ قیمت کی احتیاج نہیں، ٹکٹ واپس ہوتے ہیں۔۔۔۔[5] یہاں کے لوگوں نے سنا ہے کہ حضور کو سرکار میں بہت دخل ہے۔ اس لئے بعض دقیقہ سنج

---

[1] جلوہ خضر میں لفظ "جمیع" نہیں ہے
[2] جلوہ خضر میں نقطے نہیں ہیں۔
[3] جلوہ خضر میں سہو کتابت سے "رقم" لکھا گیا ہے۔
[4] عود ہندی میں چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کر کے غالب لکھتے ہیں:
"حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا، "بوستان خیال" کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں۔" یہاں بوستان خیال سے یقیناً ترجمہ "بوستان خیال" از صفیر بلگرامی مراد ہے۔ ورنہ حضرت صاحب عالم کو "دانہ ڈالنے" کی کیا ضرورت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب عالم کو صفیر نے اطلاع دی ہو گی کہ "پرستان خیال" کی پہلی دو جلدیں غالب کو بھیجی جا چکی ہیں صاحب عالم نے ان جلدوں کے بارے میں غالب کی رائے طلب کی ہو گی۔ "خطوط غالب" (از مولانا مہرؔ) اور "عود ہندی" (مجلس ترقی ادب، لاہور) میں اس خط کی تاریخ ۱۸۶۲ء لکھی گئی ہے۔ "پرستان خیال" کی مذکورہ جلدیں ۸۱-۱۲۸۰ ہجری میں چھپیں، اس لئے اس خط کی صحیح تاریخ ۶۵-۱۸۶۴ء ہو سکتی ہے۔
[5] چند الفاظ کرم خوردہ
[6] ایک لفظ کرم خوردہ۔

مجھ سے۔ ۔ ۔ ۔[1] کر تو منگا دے اور مجھے بھی اشتیاق ہے۔ امید ہے کہ اس عنایت سے بھی ممتاز ہوں۔ مثنوی "صبح امید" شکریہ، مثنوی بر گہر بار اصلاح شدہ صرف دو جگہ بنائی گئی ہے، ورود ہوئی اور تمت اصلاح پر طبیعت کو بڑا بھروسہ بندھا۔ دو تین غزلیں اردو اب بھیجی جاتی ہیں، امید کہ جلد اصلاح سے مزین ہو کر آئیں کہ یہاں سے اور بھی جائیں کس لئے کہ اب غزل سرائی میں مزا نہ رہا۔ جی میں ہے کہ آپ کی نگاہ سے اپنا سب کہا سنا گزران کر چھپوا دوں۔ زیادہ تمنائے حضوری ہے۔

رباعیات

اب ذکر شباب ہے کہانی افسوس
آگے قدر اس کی کچھ نہ جانی افسوس
لو نقشِ قدم تک نہیں ملتا ہے صفیر
کن پاؤں چلی گئی جوانی افسوس

دنیا ہے گزرگاہ خبردار رہو
تاکو نہ کسی کا مال ہشیار رہو
اک دن دنیا کو چھوڑ دینا ہے صفیر
اپنی شے سے بھی دست بردار رہو

کم زور قدم ہیں، ہے بھر شیب میں آنکھ
داخل نہ قوا ہیں پاؤں نہ زیب میں آنکھ
حرکت ہے بے عصا و عینک دشوار
۔۔۔[2] پاؤں میں ہاتھ اور رکھو جیب میں آنکھ

کیا کہیے کہ طبع کیسے گھراتی ہے
لکنت مرے کہنے میں نہیں آتی ہے
اس عقدے کا باعث سخن تر ہے صفیر
بھیگے جو گرہ اور بھی جم جاتی ہے

ے کش تھے کبھی ہم بھی جوانوں کی طرح
اب ہو گئے وہ جلسے فسانوں کی طرح
پیری میں کریں سلسلۂ سبحہ درست
پھر کاش ہوں جمع لوگ دانوں کی طرح

سو بار طلب نزع میں ہر چند رہی
پر ان کی ادا وضع کی پابند رہی
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ [3] کہ ہم
آنکھیں تو کھلی رہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

---

[1] چند الفاظ کرم خوردہ
[2] ایک لفظ کرم خوردہ
[3] ان اشعار میں جہاں کہیں نقطے لگائے گئے ہیں، وہاں سے اصل کتاب کرم خوردہ ہے۔

ابیاتِ جناب اوستادی[۱]

غصے میں کیا علاج کئے دردِ بیں شیس ... ہیرا کھلادو ... دانتوں کو پیس کے
دونوں .. میرے خوش خط ہیں کس قدر ... لکھے ہوئے ہیں .. نجوشنویس کے
دیکھو شکستہ حالی دیوانگانِ عشق دامن پھٹے ہیں دس کے گریباں دس کے
تیغ نگاہ ناز کے جوہر چمک گئے سر نے کھل کے رنگ دکھائے کیس کے
جاتی رہیں صفیرؔ وہ دقت پسندیاں اب ہیں مزے پڑے ہوئے لفظ سلیس کے

ہوا ہے دل غم ساقی میں لاجواب میں آب یہ شیشہ آپ ہوا حسرت شراب میں آب
ورق ہیں جو نقش مضمون گریہ یار بسانِ ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب
ہیں محتسب ہی کو کوسوں کا پانی پی پی کر تمام عمر پیوں کا نام شراب میں آب
ہٹا کے کون ہوا ہے کنار دریا سے کر اپنی موج سے ہر دم ہے پیچ و تاب میں آب
تمہارے عشق کی تاثیر پھر دو بر میں ہے کہ جو ہے تاب میں ہے خاک اضطراب میں آب
کبھی ہوں گرم کبھی سرد حسب موقع وقت صفیرؔ آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

آہ اب ہونٹوں پر نہیں آتی ہائے دل کی خبر نہیں آتی
تم رلاتے ہو تو میں روتا ہوں خود بخود آنکھ بھر نہیں آتی
کس طرح ہوگا وصل اے اللہ کوئی صورت نظر نہیں آتی
ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا ابھی کچھ بات کر نہیں آتی
ایک میری خبر ہے بس مفقود شہر میں کیا خبر نہیں آتی
وہ نہ آئیں تو اختیار ہے کیا موت بھی تو ادھر نہیں آتی
.... ہیں وہ پھر ہم آتے ہیں نیند ....

---

۱ مراد صفیرؔ بلگرامی

۲ ان اشعار میں سے بعض پر صاد بنے ہوئے ہیں، قرینہ یہ ہے کہ غالب نے یہ صاد لگائے ہیں، کسی شعر پر ایک، کسی پر دو اور کسی پر تین یہاں اسی اعتبار سے یہاں بھی "ص" کی علامت بنادی گئی ہے

چرخ ... کچھ تو حال ہو معلوم بوں ----- خبر نہیں آتی

.... - - ہو حکومت ان پہ صفیر

چاہ بھی تم کو کر نہیں آتی

غالب نے صفیر کے مذکورہ خط کا جواب ۲۵ ذیقعدہ ، ۱۲۸۱ ہجری کو لکھا - یہ خط پہلی مرتبہ " انشائے سبد گل " (صفحہ ۱۱) میں طبع ہوا - دوسری مرتبہ " مرقع فیض " (صفحہ ۸۲-۸۳) میں شامل ہوا اور آخر میں " جلوۂ خضر " (دوم صفحات ۲۲-۲۲۳) میں چھپا -

اس خط کا ایک حصہ نادر خطوط غالب (مرتبہ رسا ہمدانی) میں چھپا تھا - رسا نے یہ خط سید وصی احمد بلگرامی کے مقالے " س ش ص " سے لیا تھا - بعد میں یہ خط مکمل صورت میں " مرقع فیض " سے لیکر " نگار " لکھنؤ کے جولائی ، ۱۹۵۲ ع کے شمارے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد نے چھپوایا تھا - مولانا مہر نے " نادر خطوط غالب " سے کر نامکمل خط " خطوط غالب " کی طبع چہارم (صفحہ ، ۷۰) میں شامل کیا گیا - " نگار " سے مکمل خط بھی لے لیا (خطوط غالب صفحہ ۶۵۹) اور اس میں سے وہ عبارتیں نکال دیں جو " نادر خطوط غالب " میں آچکی ہیں - اس طرح خطوط غالب " میں اس ایک خط کے دو خط بن گئے -

ذیل میں " انشائے سبد گل " سے اس خط کا متن درج کیا جاتا ہے حواشی میں " مرقع فیض " اور " جلوۂ خضر " کے اختلافات کی نشاندہی کردی گئی ہے -

مکتوب غالب (۵)

بہ علاقۂ مہر و محبت نور چشم و سرور دل اور[۱] برعایت سیادت مخدوم و مطاع مولوی سید فرزند احمد طال بقاءہ و زاد علاءہ - اس مصرع سے میرا مکنون ضمیر دریافت فرمائیں :

بندۂ شاہ شمائیم و ثنا خوان شما

یارب[۲] وہ کون بزرگ ہیں کہ سودائی کو معمائی سمجھتے ہیں - اصل فطرت میں میرا ذہن[۳] تاریخ و معما کے ملایم[۴] نہیں پڑا ہے ، جوانی میں از راہ شوخیٔ طبع گنتی کے تین[۵] عامیانہ معمے لکھے تھے[۶] وہ مبادی کلیات فارسی میں موجود ہیں تاریخیں

---

[۱] جلوۂ خضر میں " و " بجائے " اور "

[۲] یہاں سے " حکایت ہے شکایت نہیں " تک کی عبارت " مرقع فیض " میں نہیں ہے -

[۳] جلوہ خضر میں سہو کتابت سے " ذہین " لکھا گیا ہے

[۴] جلوہ خضر میں " ملایم و مناسب " ہے

(۵) جلوۂ خضر میں " جلوۂ خضر میں نہیں ہے

(۶) جلوۂ خضر میں " لکھے ہیں " ہے

اگر ہیں تو مادے اوروں کے [1] اور نظم نقیر کی ہے [2] یہ کلام نہ بطریق کسر نفسی ہے نہ بہ سبیل اغراق، سچ کہتا ہو اور سچ لکھتا ہوں ۔ ۔ ۔ [3] (کذا) اس نامہ مہر افزا کو دیکھ کر مبادی "پرستان خیال" کی عبارت [4] یاد آگئی ۔ افسوس کہ اس ہیچ میرز کے اجزائے خطابی اس مسودے کی تسوید کے وقت تک آپ نے نہیں سنے تھے، ورنہ اس کے کیا معنے کہ خط میں لکھے جائیں اور کتاب میں اندراج نہ پائیں ۔ محمد رضا برق کا خطاب معلوم تھا تو آپ نے لکھا ہے، حکایت ہے شکایت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (کذا) پہلی جلد جس کا نام افق الخیال ہے اس کے دیکھنے کا بہت مشتاق ہوں، جناب میر ولایت علی صاحب کو تاکید رہے کہ جب اس کا چھاپا تمام ہو بے طلب بھیج دیں اور معہ قیمت لکھ بھیجیں ۔ ۔ ۔ [5] اشعار گہربار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا سب اچھے ہیں مگر جو میرے دل میں اتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں:۔

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا
ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

کیوں حضرت! "ابھی کچھ" کی تحتانی کا دبنا کیا غیر فصیح نہیں؟

کچھ ابھی بات کر نہیں آتی

کیا اس کا نعم البدل نہیں؟

ورق میں جوشش مضمون گریہ سے بادل
بسان ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب

---

[1] جلوہ خضر میں "کے ہیں" ہے

[2] یہاں جلوۂ خضر میں صفیر نے یہ حاشیہ دیا ہے ۔ "اصل حقیقت یہ ہے کہ بندہ صفیر نے حضرت غالب کو لکھا تھا کہ پٹنہ کے لوگ آپکے معمے اور چیستاں کے مشتاق ہیں کہ ان لوگوں نے آپ کو معمے میں کامل سنا ہے ۔ اس کے جواب میں یہ عبارت حضرت غالب نے تحریر فرمائی ۔ (جلد اول، صفحہ ۲۴۳)

[3] یہ نقطے جلوہ خضر میں نہیں ہیں ۔

[4] حاشیہ از صفیر بلگرامی:۔

"اس کی حقیقت یہ ہے کہ میں نے خط جو حضرت غالب کو بھیجا تھا، اس کے القاب میں حضرت کا خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ بھی لکھا تھا اور پرستان خیال ترجمہ بوستان خیال میں جو شعرا کی فہرست ہے اس میں یہ خطاب نہیں لکھا تھا اور محمد رضا برق کا خطاب لکھا تھا ۔ حضرت نے جب پرستان خیال کو دیکھا تو وہ شکایت مجھے لکھی

[5] "انشائے سید گل" میں اس جگہ نقطے ڈالے گئے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ عبارت کا کچھ حصہ ترک کیا گیا ہے، لیکن "رقیع نیفض" میں اس قسم کی کوئی صراحت نہیں ۔ "جلوہ خضر" میں بھی اس جگہ نقطے ہیں ۔

زرقائل۔

کبھی ہوں گرم کبھی سرد حسب موقع وقت
صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ و موحدانہ مضمون اور بانغانہ الفاظ۔

تم سلامت رہو قیامت تک
صحت و لطف طبع روز افزون

نجات کا طالب[۱]

غالب ۱۲

غالب سے مذکورہ خط کی وصولی کے فوراً بعد صفیر بلگرامی نے اس کا جواب لکھا جس کا جواب الجواب غالب کی طرف سے جلد ہی آیا۔ صفیر و غالب کے یہ خط ۲۵ ر ذیقعدہ، ۱۲۸۱ ہجری اور ہفتم ذی الحجہ، ۱۲۸۱ ہجری کے درمیان لکھے گئے کیوں کر ان دو تاریخوں کے غالب کے دو خطوط موجود ہیں ان میں سے ایک اوپر درج ہو چکا ہے اور دوسرا یعنی غالب کا صفیر کے نام آخری خط، اس مقالے میں آگے کہیں درج ہوگا۔ صفیر نے غالب کے ۲۵ ر ذیقعدہ، ۱۲۸۱ ہجری کے خط کا مندرجہ ذیل جواب دیا۔ یہ خط "انشائے سبد گل" (صفحات ۲۰-۱۸) سے نقل کیا جا رہا ہے۔

مکتوب صفیر (۵)

"قبلۂ سخن سنجان معانی شناس و کعبۂ نکتہ دانان والا اساس نجم ۔۔۔۔۔۔ بلا ۔۔۔[۲] دبیر بے نظیر فلک ابہت و کرامت جناب عالی مناقب حضرت غالب مطلوب ہر طالب مدظلہ تعالے صفیر کج مج تقریر تسلیم کو ذریعہ عبودیت اور عبودیت کو وسیلۂ عزت جان کر جو کچھ عرض کرے وہ یہ ہے۔ نوشتۂ شفقت سرشتہ جس کے ہر لفظ سے شفقت کاملہ کی تراوش تھی ورود ہو کر سرفراز کیا۔ گلہ سنجی حضور کی میرے سر آنکھوں پر، اجزائے خطابی کا مبادی بوستان خیال میں نہ لکھنا بخدا سہواً تھا نہ عمداً تھا اب آپ ہی کے شعر کو شفیع سمجھ کر امیدوار عفو ہوں۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

"انق الخیال" جب چھپ کر نکلے گی، پہلے آپ کے پاس پہنچے گی، بعد میرے پاس، خاطر شریف مطمئن رہے ۔۔۔ (کذا) غزلیات مرسلہ پر جا بجا صاد دیکھ کر اور چند اشعار جو حضور کو پسند آئے ہیں۔ ان کے ساتھ چند فقرہ دلچسپ ملاحظہ کر کے میں اس

---

[۱] "مرقع فیض" اور "جلوۂ خضر" میں اس کے بعد یہ تاریخ ہے "شنبہ، ۲۵ ر ذیقعدہ، ۱۲۸۱ ہجری۔

[۲] کرم خوردہ، شاید یہاں "نجم سپہر فصاحت و بلاغت" کے الفاظ ہوں۔

اس قدر بالیدہ ہوا جس کی شرح نہیں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ۔ ۔ ۔ (کذا) پہلے شعر مطبوعہ خاطر اقدس پر جو اصلاح ہوئی ہے کہ

کچھ ابھی بات سمجھ نہیں آتی

۔ درست ہے مگر زبان دانان لکھنؤ کے یہاں عام حروف علت آخر لفظ ہندی کا گرانا دبانا جائز ہے اور غیر زبان کے لفظ کا ناجائز۔ مخصوص حروف علت میں الف اور یائے تحتانی پر تو ہمیشہ مار رہتی ہے، ہاں فصحا بضرورت اور حسب موقع دباتے ہیں اور کبھی الف اور یائے تحتانی کے بعد اگر "نون" بھی ہو، اصلی لفظ یا جمع کے حروف میں بھی دب جاتا ہے۔ آتش:

جباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا

نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

"میں" اور "ہوں" کے حروف دوم اور سوم دب گئے۔ ناسخ:

خوں رلاتا اسے ناسور بنا کر گرد دل

زخم بھی گر حسرے تن پر کبھی خنداں ہوتا

"کبھی خنداں" بروزن ۔ ۔ ۔ ۔[1] یائے تحتانی (کبھی) کی دب گئی۔ اسی طرح "ابھی کچھ با" ۔ ۔ [2] فعلاتن ۔ ۔ ۔[3] زیادہ مثالیں نہ لکھیں کہ ۔ ۔ ۔ [4] واضح ہوں گی ۔ اور ۔ ۔ ۔ [5] بھی اس سے خالی ہیں خیال آتا ہے کہ یہ مطلع حضور کا ہے۔ دیوان آپ کا اس وقت موجود نہیں:

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا

بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا

"بھی گو ویراں" فعلاتن کے وزن پر ہے۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں، فی الحقیقت خلاف ہے، مگر یہ قواعد ابھی تک مخصوص فارسی و عربی ہیں، اردو میں نہ تھے، نہ ہیں، نہ ہوں گے۔ حضور محقق اور راغب فارسی ہیں، یہ باتیں جی میں کھٹکتی ہوں گی۔ خیر ہر زبانے و ہر بیانے، اپنا اپنا اجتہاد ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔

ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخر الدین صاحب سخن (جن کا ددھیال لکھنؤ اور ننھیال دہلی میں ہے اور غدر کے سال میں عمر چاردہ پانزدہ سالگی آرہ میں تشریف لائے اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا محمد صدیق صاحب کی صاحب زادی سے منسوب ہوئے

[1] چند الفاظ کرم خوردہ

[2] ایک لفظ کرم خوردہ

[3] چند الفاظ کرم خوردہ

[4] ایک لفظ کرم خوردہ

[5] ایک لفظ کرم خوردہ

اور مجھ سے تلمذ کیا اور قصہ مسمّی بہ "سروشِ سخن" میں کو ان کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا۔ سب حال آپ سے بیان کیا تھا چل کر اس قصے کو چھپنا چاہیے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں، اس کے سوا حضور سے بڑھ کر کون ہے۔ اس لئے وہ قصہ بھیجتا ہوں حضور اس کو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظرِ تامل بنائیں کہ بڑا مقابلہ ہے اور طبیعت ان کی اچھی ہے۔ چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس پٹنہ میں اصلاح کے لئے آئی ہے۔ اس کا ایک شعر میرے دل میں کھب گیا وہ یہ ہے۔

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اور قصے کو جلد ملاحظہ فرما کر عنایت فرمائیے۔

غالب نے صفیر کے اس خط کا مندرجہ ذیل جواب دیا۔ یہ خط بھی "انشائے سبد گل" (صفحہ ۲۱۔۲۰) میں شامل ہے

مکتوب غالب (۶)

"نور الابصار، ممتاز روزگار زکی و ارشد مولوی سید فرزند احمد طال بقاءہ و زاد علاؤہ اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہنچے۔ ۔ ۔ (کذا) آج میں نے بیٹھے بیٹھے حساب کیا، یہ سترھواں برس مجھے جاتا ہے۔ ہائے:

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامہ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا اور قصہ "سروشِ سخن" اس کے دوسرے دن پہنچا۔ ۔ ۔ [1] "ابھی کچھ بات کہ نہیں آتی" کا جواب با صواب پایا۔

تم سلامت رہو قیامت تک
صحت و زورِ طبع روز افزوں

مگر ایسی باتوں سے بچنا مناسب۔ گو مجھی سے ہو ۔ ۔ ۔ [2] شاعر پابند قواعد ۔ ۔ ۔ (کذا) کچھ حواجب حواشی ناشاعر نہیں۔ ۔ ۔ (کذا) مضمون بندی کا کام ہے۔ مگر۔ ۔ ۔ [3] قواعد شاعر نہیں کہلاتا۔ الحمد للہ تم وقوف سے خالی نہیں۔ ۔ ۔ (کذا) قصہ دیکھا، آپ کی جو ہر طبع کی لمعانی اور نیرِ فکر کی درخشانی، بہت جگہ پر پسند آئی۔ اگرچہ وہ قصہ تو کچھ ن

---

[1] اصل کتاب یہاں سے کرم خوردہ ہے اس وجہ سے چند الفاظ ضائع ہوگئے۔
[2] ایک لفظ ضائع ہو گیا۔
[3] چند الفاظ ضائع ہو گئے۔

کے سلانے کی کہانی ہے مگر محنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر "فسانۂ عجائب" کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کیا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں، آیندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی۔ الفاظ کی غلطی بہت پائی جاتی ہے۔ جا بجا لاچار لکھا ہے، اور لاچار غلط ہے، کس لیے کہ چار لفظ فارسی ہے اور جیم فارسی اس کی دلیل ہے۔ اگرچہ "لا" عربی کا حرف نفی ہے مگر فارسی کا حرف نفی ہوتے کہ حرف "نا" ہے۔ "لا" کا لگانا کاتب کی جہالت ہے۔ یہ قصہ آپ کے خط سے نہیں معلوم ہوتا۔ شاید کسی کاتب سے لکھوایا ہے۔ ہائے خدا کی مار کاتبان ناہنجار پر۔ میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا۔ غزلیات فارسی اصلاح ہو کر جاتی ہیں۔ لو بس اب میں نواب ضیاء الدین خان سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر ان کو چپکا بٹھا رکھا اور وہ بھی تم کو سلامِ اشتیاق آمیز پہنچاتے ہیں اور منشی صاحب بہت بہت بندگی کہتے ہیں۔"

صفیر و غالب کے مذکورہ دونوں خطوط "متنازعٌ فیہ" ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ صفیر کے پوتے سید وصی احمد بلگرامی صاحب نے رسالہ "ندیم" گیا، بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں "س خ ص" کے نام سے ایک مقالہ لکھا۔ اس میں انہوں نے صفیر کے خط کا ایک حصہ ("ملازمت ۔ ۔ ۔ تا ۔ ۔ ۔ شباب کے بدلے") نقل کیا اور غالب کا خط بھی درج کیا لیکن اس کے بعض الفاظ حذف کر کے متعلقہ مقامات پر نقطے لگا دیئے۔ رسا ہمدانی نے غالب کا خط "نادر خطوط غالب" (کا شانۂ ادب لکھنؤ، ۱۹۳۹ء صفحات ۵۷-۵۸) میں نقل کیا۔ انہوں نے یہ خط "س خ ص" سے لیا اور سید وصی احمد کے پیش کردہ متن سے نقطے حذف کر کے اسے مسلسل کر دیا نیز شروع میں مقام و تاریخ (دہلی، ۳۰ نومبر ۱۸۶۳ء) کا اور آخر میں "نجات کا طالب ۔ غالب" کے الفاظ کا اضافہ کر دیا۔

قاضی عبدالودود صاحب نے صفیر و غالب کے مذکورہ دونوں خطوط کو جعلی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے نادر خطوط غالب کے تبصرے میں جو "معاصر" پٹنہ میں شائع ہوا تھا، موصوف (سید وصی احمد بلگرامی) سے دریافت کیا تھا صفیر و غالب کے خطوط انہیں کہاں سے ملے، لیکن انہوں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ دونوں خط میری رائے میں جعلی ہیں اور جعل سازی کی غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ سخن صفیر کے شاگرد تھے ۔ ۔ ۔ صفیر کے خط میں دہلی جانے اور وہاں غالب سے سخن کے متعلق گفتگو آنے کا ذکر ہے۔ صفیر اوائل ۱۲۸۲ ہجری میں دہلی گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور ڈھائی مہینے ٹھہرے ۔ ۔ ۔ اس سے لازم آتا ہے کہ خط دہلی سے واپسی کے بعد کا ہوگا۔ غالب کے خط میں جو ان کی عمر کا ذکر ہے اس سے اس کا زمانۂ تحریر ۱۲۸۰ ہجری ثابت ہوتا ہے لیکن سروشِ سخن (قطعات تاریخ طبع اور تاریخ ڈناسی جلد ۲ صفحہ ۲) [1] ۱۲۸۱ ہجری میں

---

[1] ۲۳ شعبان ۱۲۸۱ ہجری تک یہ کتاب طبع نہیں ہوئی تھی۔ "انشائے سبد گل" میں ریاض الدین احمد آرزو کا ایک خط شامل ہے (صفحہ ۲) جس میں یہ لکھا ہے کہ منشی نول کشور یکم جنوری ۱۸۶۵ء مطابق ۳ شعبان ۱۲۸۱ ہجری تک یہ کتاب چھاپ کر خواجہ سخن کو بھیج دیں گے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ "سروشِ سخن" اواخر ۱۲۸۰ ہجری یا اوائل ۱۲۸۲ ہجری میں طبع ہوئی ہوگی۔

لکھنؤ کے مطبع نول کشور نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ یہ خط اس کے بعد لکھے گئے ہیں۔ جعل کسی ایسے شخص نے بنایا ہے جو سروشِ سخن طبع اول کے سال انطباع سے ناواقف ہے اور اس بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے ذمہ دار صفیر نہیں۔ یہ مستبعد ہے کہ وہ اسے نہ جانتے ہوں۔" (۱)

غالب و صفیر کے خطوط "انشائے سبدِ گل" میں شامل ہیں جو ۱۲۸۹ ہجری میں چھپنی شروع ہوئی تھی، یہ خطوط ظاہر ہے کہ صفیر کی زندگی میں طبع ہوئے اور جیسا کہ قاضی صاحب نے لکھا ہے صفیر سے یہ بعید ہے کہ وہ "سروشِ سخن" کی طبع اول سے واقف نہ ہوں اگر ان خطوط کو جعلی قرار دیا جائے تو اس کے ذمہ دار صفیر ہی قرار پاتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں۔ لیکن صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس مسئلے کو صفیر و سخن کے تعلقات کے پس منظر میں سمجھا جائے۔

سخن ۱۲۷۵ ہجری میں آرہ میں آئے اور یہیں انہوں نے ۱۲۷۶ ہجری میں "سروشِ سخن" لکھی۔ ابتدا میں صفیر و سخن میں نہایت خوشگوار تعلقات تھے جو بعد میں خراب ہو گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "سروشِ سخن" کی تالیف میں صفیر کے مشوروں کو دخل تھا، اسے خود سخن نے بھی تسلیم کیا ہے۔ لیکن ایسے انداز میں کہ جس سے صفیر کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ (تنبیہ صفیر بلگرامی صفحات ۸۹ ـ ۷) اگر سخن ہی کے بیان کو لیا جائے تو صفیر و سخن کے جھگڑے کا آغاز "سروشِ سخن" کی طباعت سے کچھ عرصہ پہلے سے ہوتا ہے صاحب تنبیہ صفیر بلگرامی کے قول کے مطابق صفیر نے "سروشِ سخن" کا مسودہ صاف کیا تھا، دورانِ کتابت وہ اس میں اپنے اشعار درج کرتے چلے گئے، جنہیں سخن نے بعد میں خارج کر دیا۔ اور صرف دو چار شعر رہنے دئے۔ صفیر نے "سروشِ سخن" کی تین نقلیں تیار کی تھیں۔ ایک نقل کسی دوسرے صاحب نے تیار کی تھی۔ ممکن ہے یہی آخری نقل صفیر نے غالب کو بھیجی ہو۔ خیال ہے کہ غالب کے ۲۵ ذیقعدہ ۱۲۸۱ ہجری کے خط کا جواب جو صفیر نے لکھا، "انشائے سبدِ گل" میں شامل کرتے وقت اس میں "سروشِ سخن" سے متعلق حصہ تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخن پر یہ واضح کیا جائے کہ صفیر کو "سروشِ سخن" کی تصنیف ہی سے نہیں طباعت سے بھی دلچسپی تھی۔ یعنی اس خط کا آخری پیراگراف (ملازمت کے وقت ... تا عنایت فرمائیے) بعد کا اضافہ ہے۔ اصل خط میں صرف "سروشِ سخن" کے بھیجنے اور اپنی محنت کا ذکر ہوگا جسے حذف کر دیا گیا۔ اس خیال کو غالب کے جواب سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔ صفیر کے خط کے آخری پیراگراف میں "سروشِ سخن" کی طباعت کے لئے مدد چاہی گئی ہے، اور یہی صفیر کا اصل مقصد معلوم ہوتا ہے لیکن غالب کے جواب میں اس کا کوئی ذکر نہیں بلکہ صفیر کی محنت کی تعریف کی گئی ہے۔ اگر غالب کے نام اصل خط میں طباعت کا مسئلہ اٹھایا گیا ہوتا تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔ صفیر کو آرہ و پٹنہ میں طباعت کی سہولتیں میسر تھیں، اور اس وقت تک ان کی کئی کتابیں چھپ چکی تھیں، ایسی صورت میں ان کا "سروشِ سخن" کی طباعت کے لئے غالب کی مدد چاہنا ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ مذکورہ خط کے آخری پیراگراف کے سوا باقی خط کو جعلی قرار

---

(۱) آئینۂ غالب، صفحات ۳-۱۰۲

دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس میں غالب کے خط مکتوبہ ۲۵/ذی قعدہ ۱۲۸۱ ہجری کی باتوں کا جواب ہے۔

قاضی صاحب نے غالب کے خط کے جعلی ہونے کے سلسلے میں یہ دلیل بھی دی ہے کہ اس میں غالب نے اپنی عمر کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اس کا زمانۂ تحریر ۱۲۸۲ ہجری ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ خط ۲۵ ذیقعدہ اور ۷ ذی الحجہ ۱۲۸۱ ہجری کے درمیان کا ہے۔ ۱۲ رجب ۱۲۸۱ ہجری کو غالب اپنی زندگی کے ۶۹ سال پورے کر چکے تھے، اور اب ان کا یہ کہنا "یہ سترہواں برس سمجھے جاتا ہے" بالکل درست ہے۔ ان خطوں کو مشکوک قرار دینے کی سب سے بڑی وجہ صفیر کے خط کا آخری پیراگراف ہے، جس میں انہوں نے غالب سے اپنی ملاقات کا ذکر کر دیا ہے۔ "انشائے سبد گل" کی طباعت کا آغاز ۱۲۸۹ ہجری میں ہوا۔ غالب سے ان کی ملاقات کو سات برس گزر چکے تھے، اس لئے انہوں نے بے دھیانی میں اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لئے غالب سے ملاقات کے ذکر کا اضافہ کر دیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سخن اور صفیر کے تعلقات اب پہلے جیسے خوش گوار نہیں رہے تھے اور سخن صفیر کی شاگردی سے منحرف ہو چکے تھے۔ صفیر نے سخن کو اپنا شاگرد قرار دینے کے سلسلے میں اپنے ہی خط میں اس پیراگراف کا اضافہ کر دیا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ صفیر کے خط کے مذکورہ پیراگراف کے سوا صفیر و غالب کے خطوں میں کوئی عبارت ایسی نہیں ہے کہ اسے جعلی قرار دیا جا سکے۔ مکتوب غالب کے جعلی ہونے کے خیال کو اس امر سے بعد میں تقویت پہنچی کہ اسے جعلی خطوط (نادر خطوط غالب) کے ایک مجموعے میں شامل کیا گیا۔

غالب کے خط کا صفیر نے کیا جواب دیا؟ یہ معلوم نہ ہو سکا لیکن صفیر کی بیاض میں پانچ شعر کی ایک غزل ملتی ہے جس کا مطلع یہ ہے:۔

بہار آئی ہے اے ابر نو بہار برس
میں بار بار ہوں روتا تو بار بار برس

اس غزل کے آخری دو شعر یہ ہیں

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرتِ غالب
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد غین کہہ ہے صدا
خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس

یہ واضح ہے کہ یہ قطعہ غالب کے اس شعر کے جواب میں کہا گیا تھا، جو انہوں نے مذکورہ خط میں اپنی عمر کے سلسلے میں لکھا تھا۔

غالب کا جواب آنے کے بعد صفیر نے دو خط لکھے، جن میں سے پہلے میں مذکورہ قطعہ یا پوری غزل لکھی گئی ہوگی۔

یہ دونوں خط دستیاب نہیں ہو سکے۔ لیکن ان کا ذکر غالب نے مندرجہ ذیل خط میں کیا ہے۔ اور یہی غالب کا صفیر کے نام آخری خط ہے۔ یہ خط پہلے "مرقع فیض" (صفحہ ۸۷) میں اور بعد ازاں "جلوۂ خضر" (جلد دوم صفحات ۲۵-۲۲۴) میں چھپا۔

مکتوب غالب (۶)

نور چشم و سرور دل، فرزانۂ مرتضوی گہر مولوی سید فرزند احمد صاحب، زاد مجدہ اس نسبت عام سے کہ ہم اور آپ مومن ہیں، سلام اور اس نسبت خاص سے کہ آپ میرے دوست روحانی کے فرزند ہیں دعا اور اس کی نسبت اخص سے کہ آپ میرے خداوند کی اولاد میں سے ہیں، بندگی۔

میں قائلِ خدا و نبی و امام ہوں
بندہ خدا کا اور علی کا غلام ہوں

آپ کے دو خطوں کا جواب بسبیل ایجاز لکھا جاتا ہے۔ دُہائی خدا کی مجھے ولایت کی اپیل کی تاب نہیں، نہ تم ایپلانٹ بنو، نہ مجھے رسپانڈنٹ بناؤ۔ لکھ بھیجو کہ "صبح بہار" کی عبارت فارسی ہے یا اردو اور ماکتب فیہ اس کا کیا ہے۔

نجات کا طالب غالب[۱]

چہار شنبہ، ہفتم ذی الحجہ، ۱۲۸۱ ہجری

صفیر و غالب کی ملاقات

غالب کے مذکورہ خط کے بعد صفیر و غالب کی مراسلت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۲۸۲ ہجری کے اوائل میں صفیر دہلی گئے اور وہاں انہوں نے غالب سے ملاقات کی۔ وہ دہلی میں دو ڈھائی مہینے ٹھہرے۔

صفیر نے غالب سے اپنی ملاقات کا ذکر اپنی تصانیف میں متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ان بیانات میں سفرِ دہلی کے لیے میں مختلف سنین ملتے ہیں۔ "رشحات صفیر" میں وہ لکھتے ہیں:

"۔۔۔ میں نے اس رسالے (رشحات صفیر) کو جب درست کیا تو میں ۱۲۸۰ ہجری میں حضرت غالب کی ملازمت کو دہلی گیا اور شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ اس رسالے کا مسودہ میرے ساتھ تھا، حضرت نے اپنی چشم عنایت سے ملاحظہ فرمایا اور اس کی تقریظ لکھ کر عنایت کی جو عودِ ہندی میں چھپی ہے۔" (صفحہ ۱۴۳)

"جلوۂ خضر" (جلد اول، صفحہ ۲۱۶) میں مفتی صدرالدین آزردہ کے حال میں لکھتے ہیں:

"مولف کتاب (صفیر) ۱۲۸۳ ہجری میں جب حضرت غالب کی ملازمت کے واسطے دہلی گیا تھا، ان کی خدمت سے بھی فیض یاب ہوا۔"

۱؎ "نجات کا طالب" کے الفاظ جلوۂ خضر میں نہیں ہیں۔

جلد اول ہی میں صاحب عالم کے ذکر میں (صفحہ ۲۰۰) دہلی جانے کا سنہ ۱۲۸۳ ہجری بتایا ہے۔ اسی جلد کے صفحہ ۲۴۲ پر انہوں نے یہ سنہ ۱۲۸۲ ہجری لکھا ہے اور پھر "جلوۂ خضر" (جلد دوم) میں اپنے حالات لکھتے ہوئے صفحہ ۱۸۸ پر کہا ہے:

"۱۲۸۳ ہجری میں پینتیسویں برس فارسی پر توجہ ہوئی، دہلی جا کر حضرتِ غالب کی شاگردی کی۔"

اسی جلد کے صفحہ ۲۱۶ پر یہ بتایا ہے "۱۲۸۲ ہجری میں محرم کے آخر مہینے میں حضرت (غالب) کی ملازمت کے لئے دہلی گیا اور دو ڈھائی مہینے حاضر رہ کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا"۔ گویا صفیر کے اپنے بیان کے مطابق سفر دہلی ۱۲۸۰ ہجری، ۱۲۸۳ ہجری اور ۱۲۸۲ ہجری میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے اور یہ بھی طے ہے کہ صفیر ایک سے زائد مرتبہ دہلی نہیں گئے۔ ۱۲۸۱ ہجری کے آخر تک صفیر کا آرہ میں مقیم ہونا ثابت ہے، کیوں کہ غالب کا آخری خط، ذی الحجہ ۱۲۸۱ ہجری کا ہے جو صفیر کو آرہ میں ملا۔ ۱۲۸۳ ہجری میں بھی صفیر آرہ میں تھے اور اس کا ثبوت غالب کا وہ خط ہے جو صاحب علم مارہروی کے نام ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء (۱۵ ربیع الآخر ۱۲۸۳ ہجری) کو لکھا گیا تھا اور جس میں صفیر کا ذکر ہے اور یہ صریحاً لکھا ہے کہ وہ پٹنے (آرہ) میں موجود ہیں۔ صفیر بقول خود محرم کے آخر میں دہلی گئے اور دو ڈھائی مہینے وہاں رہے۔ اس لئے ۱۵ ربیع الآخر تک دہلی میں ان کا رہنا لازم ہے۔ غالب کے مذکورہ مکتوب سے پہلے صاحب عالم کو رشحات صفیر کا دیباچہ مل چکا تھا اور وہ اسے صفیر کے پاس بھیج چکے تھے۔ یہ سب کچھ طلوع ہلال سے پہلے ہوا۔ اگر صفیر ۱۲۸۳ ہجری کے اوائل میں دہلی میں ہوتے تو دیباچہ صاحب عالم کو کیوں بھیجا جاتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صفیر نے ۱۲۸۳ ہجری میں غالب سے ملاقات نہیں کی۔ اب ۱۲۸۲ ہجری ہی ایسا سال رہ جاتا ہے۔ جس میں صفیر کا دہلی اختیار کرنا یقینی ہے۔ غالب سے ملاقات کا حال صفیر نے تفصیل کے ساتھ "جلوۂ خضر" جلد اول کے جلوۂ پنجم میں (صفحات ۲۰۸ ـ ۲۱۸) بیان کیا ہے۔ صفیر نے غالب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

غالب علیہ الرحمہ

"اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، اکبر آبادی مولداً، دہلی مسکن، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، یہ وہ خوش مذاق شخص گزرا ہے جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا کیا۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولایتی فارسی کا یقین چار شخصوں کے کلام پر ہوا۔ اول امیر خسرو، دوم حسن دہلوی، سوم مرزا بیدل، چہارم غالب۔ اگرچہ ناصر علی سرہندی اور مرزا جانجاناں مظہر اور غنی کشمیری غنیمت اور خان آرزو اور آزاد بلگرامی اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین فریاد، یہ سب کے سب خوش گو اور شاعر بے بدل تھے۔ مگر جامۂ ایجاد جو خداداد ہے، انہیں چاروں کے راست قامت پر راست آیا۔ اور ان چاروں کے سوا جن کے نام نامی لکھے گئے ہیں، ان پر بھی نغز گفتاری کا خاتمہ ہوا۔ گو ان کے سوا اور بھی شعرائے فارسی ہندوستان میں ہوئے مگر ان لوگوں کی خوبیوں کو نہیں پاتے۔ اور یہ لوگ ان چاروں کی شہرت ایجاد نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ تو خدا کی دین ہے۔

"اہل مذاق با انصاف میرے اس لکھنے کا برا نہ مانیں۔ میرا خاندان سلسلہ وار صاحب علم و شاعر گزرا ہے۔ سید خورشید علی خورشید تخلص میرے پر دادا کے والد اور سید بندہ علی بندہ میرے پردادا۔ سید غلام یحییٰ یحییٰ تخلص میرے دادا

حضرت صاحب عالم میرے نانا۔ یہ سب کے سب فارسی کہنے والے اور بڑے بلند خیال تھے۔ اسی طرح بلگرام میں بہت شعرائے فارسی اپنا ڈنکا بجا گئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ میں نے علامہ عبدالجلیل بلگرامی کو بھی کہ نعمت خان عالی کے ہم عصر اور ہم طرح و تابع میں تھے شمار نہیں کیا اول کہ یہ لوگ اور پایہ رکھتے تھے۔ غرض میرے نزدیک آغاز امیر خسرو سے ہوا۔ اور انجام غالب دہلوی پر ہوا۔ ہندوستان کی فارسی کا شمس الدین فقیر دہلوی کے وقت سے ایک طرز خاص سلاست آمیز شروع ہوا تھا۔ رنگ ہی بدل دیا اور بڑی ہمت کر کے فارسی کو پھر نہایت کی کرسی پر بٹھایا، ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ اردو نظم بھی ایک طرز خاص کی کہی، اس میں بھی ایجاد خاص ہے۔ آخر میں میر تقی کا رنگ کل اتار لیا۔ اوائل میں حضرت نے ناسخ کی ایجاد پر توجہ فرمائی اور فارسی گوئی کی عادت سے اس کو بلند کر دیا یعنی نہ ناسخ کی طرز رہی اور نہ دہلی کی۔ دقت پسندی کے ساتھ ترکیب و بندش فارسی زیادہ کر دی یہاں تک کہ سوائے فعل کے کوئی لفظ ہندی اکثر شعروں میں نہیں آیا۔ مثلاً:

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
نقشِ ناز بت طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پے خامۂ مانی مانگے

اس میں "آیا" کی جگہ "آمد" اور "مانگے" کی جگہ "طلبد" بنا دو تو فارسی کا مطلع اور شعر ہے۔ اسی پر حضرت نے فرمایا ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

مگر جب دقیقہ سنجوں نے حضرت کے اشعار کو بے معنی کہنا شروع کیا تو حضرت نے فرمایا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اس پر بھی لوگوں نے اکتفا نہ کی اور زبانی حضرت سے کہا کہ آپ مشکل پسندی کو چھوڑ دیجئے۔ چنانچہ اس کا ذکر جناب آزاد نے آب حیات میں کیا ہے۔ اسی وقت حضرت نے یہ رباعی کہی۔ رباعی:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن ورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

آخر اپنے دیوان کو منتخب فرمایا اور کوئی بیس جزو کا چار جزو پر دارومدار رکھا اور یہ شعر فرمایا:۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے۔

یعنی حضرت کا مذاق خاص اس انتخاب سے معلوم ہوگیا۔ واقعی انتخاب وہ کیا کہ اب اس سے زیادہ انتخاب نہیں ہوسکتا اور اس انتخاب کے بعد سے میر تقی میر کے طرز کو اختیار کیا اور آغاز اپنا اس شعر سے کیا۔

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

اس پر ذوق نے طعن سے کہا ہے:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مگر حقیقت میں میر کا انداز جو کچھ برتا تو غالب ہی نے برتا۔ اگرچہ میر تقی کی زبان کی مناسبت تو نہیں ہے کیوں کہ اُن کے وقت میں زبان بہت کچھ صاف ہو چکی تھی، مگر بندش اور الفاظ کی چستی اور درستی بالکل میر کی ہے مگر کبھی میر سے انحراف نہ کیا۔ شوخیِ طبع سے اگر کیا بھی تو یوں کیا:

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذوق کو ان سے کچھ مناسبت نہیں تھی۔ چنانچہ فارسی کے دیوان میں قطعات حضرت غالب کے اسی عدم مناسبت کی دلیل ہیں اور جناب آزاد نے بھی آب حیات میں اس کا اشارہ کیا ہے۔ اردو نثر میں پوری واقعہ نگاری کا ایجاد انہیں کا ہے، ورنہ اس سے پہلے مرصع اور مسجع غیر واقع نثر لکھی جاتی تھی اردوئے معلّیٰ انہیں جواہر بھرے خطوط کا مخزن ہے جس میں اس نئے ایجاد کا رنگ ہے۔ بعد طبع اردوئے معلّیٰ چودھری عبدالغفور صاحب سرور مارہروی نے کہ حضرت غالب کے شاگرد تھے اور مرید حضرت صاحب عالم صاحب مولف کے نانا کے تھے وہ خطوط اردو حضرت غالب کے جو ان کے نام اور جناب نانا صاحب کے نام اور لوگوں کے نام آئے تھے، جمع کرکے اس کا نام "عود ہندی" رکھا۔ جن دنوں میں حضرت غالب کی ملازمت کو مارہرہ ہو کر دہلی گیا تھا تھا وہ انشائے مرتب ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس مسودے کی نقل میں اپنے ساتھ بھی لایا تھا اب تو وہ کتاب چھپ گئی مگر میرے نام کے خطوط چونکہ بعد اس کے میرے پاس آرہ اور پٹنہ میں آئے تھے، وہ اس ترتیب میں داخل ہونے سے رہ گئے۔[۱][۲] مگر ایک تقریظ رسالہ "رشحات صفیر" المشہور بہ "فیض صفیر" "تانیث و تذکیر" کی اس میں چھپی ہے تشریح اس نثر اردو کی انشاء اللہ تذکرہ نثر اردو میں کی جائے گی۔

---

[۱] (کذا) [۲] اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے

حضرت غالب کا حال کمال شہرت سے محتاج بیان نہیں اور جناب آزاد نے "آب حیات" میں بہت مشرح مع لطائف کے سب کچھ لکھا ہے۔ مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی مختصر کیفیت اپنی ملازمت اور شاگردی کی یہاں لکھ دوں۔ وہ بھی لطائف سے خالی نہیں۔

مولف کا دہلی جانا اور حضرت غالب سے شاگردی کا خلعت پانا

۱۲۸۰ ہجری میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا، اور بعد شادی کے اپنے نانا صاحب عالم صاحب سجادہ نشین۔ مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رستے میں فرخ آباد پڑا، وہاں جناب ڈپٹی کلکٹر کلب حسین خاں بہادر نادر سے ملاقات کا لطف[۱] اٹھایا۔ جب مارہرہ پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیض یاب ہوا وہاں حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا۔ نانا صاحب سے اور ان سے ایک ربط خاص تھا مگر لطف یہ ہے کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی میں نے خواہش کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی و اردو و غزل ہندی کے مارہرے سے روانہ کیا، حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد مثنوی ابر گہر بار کی اور جواب میرے خط کا بھیجا۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر بہ فرمائش تفضل حسین خان (جنہوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) مارہرے میں کہا تھا کہ حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لئے بھیج کر بلگرام آیا۔ اور وہاں سے اسے بھیجا، حضرت غالب نے اس مخمس پر ایک جگہ مقطع کی اصلاح دے کر بھیج دیا۔ جب میں نے بوستان خیال کو اردو کر کے اس کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اخبار مشتہر ہوا حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس پٹنہ میں بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی۔ اس وقت سے خط و کتابت رہی، یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ ہجری میں بے اختیار مجھے آرے سے دہلی چلنے کی تحریک کی اور بے نشان گمان مارہرے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانہ دہلی ہوا۔ آموں کا موسم تھا نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیئے۔ میں علیگڑھ سے دہلی روانہ

پچھلے صفحے کا حاشیہ

یہ درست نہیں ہے، صفیر کے نام تمام خطوط ۱۲۸۱ ہجری تک کے ہیں۔ ان کا غالب کے کسی مجموعے میں شریک نہ ہونا تعجب خیز ہے۔ اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ یہ خطوط مرتب ہو رہے تھے تو صفیر دہلی میں تھے۔ صفیر کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ "اردوئے معلی" پہلے چھپی اور "عود ہندی" بعد میں "عود ہندی" ۱۰ رجب، ۱۲۸۵ ہجری (مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء) کو شائع ہوئی اور "اردوئے معلی" ۶ مارچ ۱۸۶۹ء (مطابق ۲۱ ذیقعدہ، ۱۲۸۵ ہجری) کو شائع ہوئی۔ صفیر نے سرور کو عود ہندی کا مرتب قرار دیا ہے۔ یہ بھی درست نہیں "عود ہندی" کی پہلی فصل سرور کی مرتبہ ہے جس کا نام "مہر غالب" ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں صفیر نے متعلقہ کتابوں کو پیش نظر رکھے بغیر حافظے سے لکھی ہیں

۵۔ اصل "کی" "کو" سہو کتابت ہے

ہوا۔ دس بجے شب کو دہلی پہنچا۔ شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی، صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماران میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔ حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے، ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے۔ دیکھ کر بشاش ہو گئے۔ اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا، پوچھا یہ کون ہیں۔ عرض کیا صفیر۔ ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا۔ بولے ذرا ٹھہر جائیے۔ یہ کہہ کر ہاتھوں کو بدقت زمین پر ٹیک کر اٹھے اور بغل گیر ہوئے، اور برآمدے سے اندر آ کر بیٹھے، گرمی کے دن تھے صفر کا مہینہ تھا۔

حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا: پاجامہ سیاہ بوٹے دار دریس کا، کلی دار، بیفہ سرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی، سر کھلا ہوا، رنگ سرخ سفید، منہہ پر ڈاڑھی دو انگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت، پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرت شراب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں۔ اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آنکھوں میں نور موجود تھا۔ کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔

الغرض اندر آ کر بیٹھے، بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں، اتنے میں نواب ضیاء الدین خان بھی تشریف لائے، حضرت نے مجھے ان سے ملایا۔ وہ بھی وجیہہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے، کرتا پہنے خلطہ دار پاجامہ، سر پر ٹوپی، جریب ہاتھ میں بعد اس کے حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں۔ اس کے بعد کچھ ان سے سرگوشی ہوئی۔ جب وہ اٹھ گئے اور دوپہر قریب ہوئی تو حضرت اٹھے اور مجھے اور ماموں صاحب کو اپنا تمام مکان دکھایا۔ ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لئے ہے اور یہ فلاں کام کے واسطے، آخر زینے کے پاس آئے اور چھت پر چلے، ہم لوگ بھی ساتھ تھے۔ اوپر کو جا کر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرہ گلی کے رخ بنا ہوا تھا۔ لطیفہ: فرمایا میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے۔ یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے، میں نے کہا سمجھا، یعنی گرمی کے دن ہیں دہلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ایکی گرمی فرو ہوتی ہے۔ الغرض پھر کوٹھے سے نیچے آئے اور فرمایا اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں۔ اس لئے ضیاء الدین خان صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے، آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ گو تھوڑا سا دور ہے مگر آرام بہت ملے گا۔ میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے فرمایا کچھ ایسا دور نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور میرے ساتھ کیا، ہم لوگ اس مکان میں پہنچے، وہ مکان عالیشان تھا ایک بڑا پھاٹک بر سر سڑک، جس پر ایک بنگلہ خوشنما بنا ہوا، اس کے اندر ایک خانہ باغ ترو تازہ، اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش و فروش سے آراستہ سجا سجایا، اس کی پشت پر محل سرا دونوں بغلوں میں کمرے، غرض بہت خوش آب ہوا مکان ملا، ہم سب چھ آدمی تھے اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے۔ الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان جن پر خوان پوش خوشنما پڑے تھے انہیں رفیق کے ساتھ آئے معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ و خوشبو تخمی آم تھے۔ میں نے خیال کیا کہ جب

یہ آم خود ایسے ہیں پھر میرے ساتھ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں - الغرض کھانا کھایا بہت مزے دار اور خوشگوار تھا - قورمہ، قلیہ، خیر حال، پلاؤ، زردہ، شیر برنج، متنجن، کباب، پراٹھا سب کچھ تھا، بعد کھانے کے آم جو کھانے بیٹھا صورت حرام نظر آئے بالکل کھٹے یں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا، بڑی نفرت ہوئی، اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھائے ان سے کہیں بہتر پائے پھر تو میں نے نصف ٹوکرا حضرتِ غالب کی خدمت میں بھیجا - وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی جس کا آخر مصرع مجھے یاد ہے "کھانا نہ اسے کہ یہ پرائے ہیں آم" اور سب آم منگالیے - آم کا شوق حضرت کو بہت تھا - الغرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا، آموں کی بہت تعریف کی - قریب مغرب میں فرودگاہ پر آیا - صبح کو نیش صفیر رسالہ تذکیر تانیث کا مسودہ دے کر گیا، حضرت نے غور کرکے دیکھا اور بے عینک کے - یکھا دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا اور بہت تعریف کی اور اس کی تقریظ لکھ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھ چھپی ہے، اور عودِ ہندی میں بھی موجود ہے - ہر روز کی ملازمت سے طبیعت بہت محظوظ ہوتی رہی ہے -

ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پہ لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا، بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیو گے؟ میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پینا ہو تو بلوائیے - ہنسکر بولے ضرور - اور آدمی کو پکار کر کہا کہ فلاں کنوئیں سے پانی لے آؤ - میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا، فرمایا برف ہی کا ہے، غرض پانی آیا، پیا، واقعی سرد تھا، فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہوتا ہے -

ایک دن ایک صاحب نے مجھے پوچھا اور مذہب کو استفسار کیا ماموں صاحب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا منہم اور میری طرف اشارہ کرکے فرمایا منا -

ایک دن مرثیے کا ذکر آگیا - فرمانے لگے کہ میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا، تین بند کہہ کر دیکھا تو دل سوختہ ہو گیا وہ بند یہ ہیں:

مرثیہ فرمودۂ حضرت غالب

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو ❊ اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو ❊ اے ماتمیانِ شہہِ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو ❊ ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو ❊ گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ نحرِ گہر نہ پایا یہ جو مدت سے بجا ہے[1]
کیا خیمۂ شبیرؑ سے رتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا[2]　　کچھ اور ہی نقشہ ہے دل چشم و زباں کا[3]
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا　　ہو گا دل بیتاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے[4]
گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے

پھر فرمایا کہ واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے، دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھ اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لئے معمولی پلاؤ، قورمہ، قلیہ، شیر مال وغیرہ بھیج دیتا ہے، آج آپ میرا کھانا دیکھئے۔ الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا۔ ایک دسترخوان بچھایا گیا اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا۔ اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور ایک تانبے کی رکابی میں تین پھلکے روپے سکے۔ اور ایک رکابی تانبے کی خالی۔ پھر وہ رفیق آکر بیٹھے، انہوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کئے اور خالی رکابی میں رکھے اور پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور تھوڑا شوربا لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر دو لقمے اندازے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا، اتنے میں حضرت پلنگڑی اترے اور دسترخوان پر آ بیٹھے۔ پہلے وہ دونوں لقمے نوش جان فرمائے، اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا بعد اس کے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے۔ اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا اور کھا چکے۔ اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے۔ شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھا لیتا ہوں۔

ایک دن نواب ضیاء الدین خان نے میری دعوت کی۔ بہت تکلف سے کھانا کھلایا، میں انکے کھانوں کی تعریف نہیں کر سکتا بہت دیر تک باتیں ہوا کیں۔ ایک دن مولوی صدر الدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے۔ ان کے فیض سے بھی کامیاب ہوا۔ ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بھیجا۔ وہ میلہ بھی قابل دید تھا، دہلی کا میلا کیا کہنا ہے میں نے دہلی کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی۔ جامع مسجد کو دیکھا، سبحان اللہ کیا کہنا ہے۔ تبرکات کی زیارت کی جناب امیر اور حسنین علیہم السلام کے دست مبارک کے قرآن لکھے ہوئے دیکھے۔ خط کوفی میں تھے۔ چوک کی سیر روز کرتا تھا۔ بازاروں میں پھرتا تھا، مگر دہلی عجب مقام ہے، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں، چیزوں کی خریداری کو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو۔ کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو۔ خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لاتے اور بہت تپاک سے ملے، دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے، وہاں کی غزلیں میرے دیوان مخزن شعر

---

[1] دیوان غالب، نسخہ عرشی ... بجا ہے　　[2] 〃 〃 کچھ اور ہی عالم ہے دل و چشم و زباں کا
[3] 〃 〃 کچھ اور ہی نقشہ نظر آتا ہے جہاں کا　　[4] 〃 〃 اب صاعقہ اور مہر میں کچھ فرق نہیں ہے

میں چھپی ہیں، چند شعر ان غزلوں کے یہ ہیں۔[1]

غرض دہلی میں رہ کر خوب سیر کی، خوب لطف اٹھائے۔ آخر رمضان ۱۲۸۲ ہجری تک آرے چلے آئے۔ جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے خط و کتابت جاری رہی، آخر ۱۲۸۵ ہجری میں انتقال فرمایا۔

کلام معجز نظام ان کا فارسی اور اردو ہر جگہ موجود ہے مگر دو غزلوں میں سے کچھ لکھے دیتا ہوں، ایک وضعِ اوّل کی اور دوسری وضعِ ثانی کی۔[2]

صفیر نے دہلی کے قیام میں غالب سے متعدد ملاقاتیں کیں اوپر کے بیان میں پہلی ملاقات کی تفصیل اور چند دیگر ملاقاتوں سے متعلق واقعات درج ہوئے ہیں۔ مومن خان مومن کے حالات لکھتے ہوئے بھی صفیر نے "جلوۂ خضر" جلد اول (صفحات ۳۰۴-۳۰۵) میں غالب سے ملاقات کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"مجھ سے اور حضرتِ غالب علیہ الرحمہ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں حضرت اپنے ایک رسالے[3] کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لیے حضرت نے دیکھ کر فرمایا ہاں، اس کو دیکھو یہ ایک چیز میں نے ان دنوں بہ فرمائش ڈائرکٹر صاحب لکھی ہے۔ اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے، کوئی پانچ چھ جز و کا رسالہ تھا، جناب ڈائرکٹر صاحب نے مولف کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجیے، چنانچہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا۔ مگر میں نے اس کا مسودہ درست کر کے بھیج دیا تھا، پھر خدا جانے کیا ہوا۔ اسی طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا، وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے۔ الغرض اسی رسالے کے پڑھنے میں کچھ دہلی لکھنؤ کی زبان کا ذکر آ گیا فرمایا، میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے، ورنہ بولتے کو کون نہیں بول دیتا اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے، مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے۔ ہاں قواعد لکھے نہیں گیا، قواعد جاننے والا اس کے کلام کے مزے پاتا ہے۔ ہماری دلّی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی دھن نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا۔ مگر یاد رہے اس مضمون میں دلّی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ پھر ہنس کر فرمانے لگے، اس زبان پر اس کے سوا اور ہوتا کیا۔ میں نے بھی ایک طرزِ خاص ایجاد کیا تھا جس میں ہر طرح مضمون کو نشو و نما

---

[1] اس کے بعد صفیر کی دو غزلوں کے اشعار ہیں۔

[2] اس کے بعد غالب کی دو غزلوں سے نہیں بلکہ تین غزلوں سے ۱۶ شعر درج کیے گئے ہیں۔

[3] اس سے مراد "نکات و رقعات غالب" ہے جو فروری ۱۸۶۷ء (مطابق شوال ۱۲۸۳ ہجری) میں چھپا۔

ہو سکتا تھا، مگر یاروں نے چلنے نہ دیا۔ اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کا ہے، میاں، جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہنچا، جیسا تم نے ولی کے دیوان کا حال سنا ہوگا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں، اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑتے، اس وقت فارسی کی شاعری دہلی میں بہت چمکی تھی، مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال میں تھی، اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نوخیز اور فارسی دان سب اس کی تقلید پر چلنے لگے اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہبری کی۔ مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دینا تھا۔ کچھ ایسی وقت نہ ہوئی۔ پھر بھی جتنے لوگوں نے ادھر توجہ کی، ہر ایک کی ایک نئی طرز ہو گئی۔ مگر ناسخ کے کلام نے (جس کو علم درکار تھا اور قاعدے کے پر تو پر ڈالا گیا تھا) دہلی میں آکر سب کو حیران کر دیا۔ اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا، یہاں تک کہ شعر نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام برآوردہ تھے: میں اور مومن خان اور ذوق۔ ذوق نے ادھر کم رغبت کی کیونکہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی، زبان کی طرف کب خیال کر سکتے ہیں (؟ تھے) مگر مومن خان نے خیال کیا۔ پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے، مگر مومن خان نے اس کو چھوڑ کر ناسخ کی طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی ادھر میں نے بھی۔ غرض ہم دونوں دہلی کی طرز کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے، مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی۔ اور کوئی ناسخ سے نہ ملی۔ میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خان اپنے اسی رنگ میں رہے۔ خلاصہ یہ کہ دہلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤ گے اور اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا، جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ہی زبان ہو گئی، وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے، ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھ ہوا وہ کیا، مگر یاد رہے کہ مضمون دہلی کا اور زبان لکھنؤ کی مستند ہے۔ ایک تمہارے بحر صاحب فرماتے ہیں۔ ع

"نہاتا ہے وہ مہ دریا میں، کپڑے حور دھوتی ہے"

یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی، بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ گھڑے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے۔ اسی طرح شعرائے لکھنؤ کے اور چند شعر پڑھے، میں نے عرض کی حضور یہ سب سچ فرمایا مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جانے اور باندھنے سے کام ہے۔ عشق و عاشقی ان کی بلا جانے۔ نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق، ان کے خیال کو خدا جانے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دردمندوں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھ دیتے ہیں کہ ہو بہو ہو جاتا ہے۔

ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں، میں بھوپال میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا، وہاں چند اشخاص اور بیٹھے تھے، دو آدمی الگ کرسیوں پر تھے۔ مجھ سے لوگوں نے کہا کچھ شعر پڑھیے، میں نے چند شعر پڑھے منجملہ ان کے ایک یہ شعر بھی پڑھا۔

کس وقت سے ہم جام ہتیلی پہ لیے ہیں
لو تھوڑی سی رنجش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وہ دونوں شخص جو کرسیوں پر تھے، آپس میں کہنے لگے یعنی یہ تورات کا بالکل واقعہ ہے۔ جناب پھر پڑھیے گا، میں نے پھر پڑھا ان لوگوں نے اس شعر کو لکھ لیا، اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں، اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا۔ جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا، فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے۔ حضور مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ آ جائے اس کو باندھ دینا چاہیے۔ کیا غریب معشوق نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک کا معشوق الگ ہوتا ہے۔ کسی کو گورا پسند ہے کسی کو سانولا۔ "معشوق منست آنکہ بہ نزدیک تو زشت است" کا حال ہے۔ یہ سن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہے۔ مگر میاں میں[1] نے غزل گو شعرا کے لئے ایک میزان درست کی ہے وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودگی (رودکی) اور فردوسی سے کر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرہ ہم تک ایک گروہ ہے، ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے سعدی و جامی و ہلالی، یہ اشخاص متعدد ہیں، فغانی ایک شیوۂ خاص

---

[1] یہاں سے "مگر مجھے کوئی ان کا شعر یاد نہیں" تک کی تمام عبارت "عود ہندی" میں چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے ایک خط میں موجود ہے۔ (عود ہندی نول کشور، ۱۸۸۱ء صفحات ۷۶-۷۷) غالب کے خط کا متعلقہ حصہ درج ذیل کیا جاتا ہے، وہ عبارت یا الفاظ جو صفیر کے بیان اور غالب کے خط میں مشترک ہیں، ان کی جگہ نقطے لگا دیئے گئے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ صفیر نے غالب کے خط میں کس قدر ترمیم کی ہے۔

"اس رقعے میں ایک میزان عرض کرتا ہوں۔ حضرت صاحب عالم ان صاحبوں کے کلام یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل، واقف سے لے کر بیدل، ناصر علی تک ایک میزان میں تولیں۔ میزان یہ ہے کہ رودکی و فردوسی ۔ ۔ ۔ تک ایک گروہ ان حضرات ۔ ۔ ۔ یہ اشخاص متعدد نہیں فغانی ۔ ۔ ۔ معانی بلند ساس شیوہ ۔ ۔ ۔ سلامت کا چربہ دیا ۔ ۔ ۔ حکیم شفائی ۔ ۔ ۔ اور سعدی کی تحریر نے ۔ ۔ ۔ تینی ظہوری ہیں خاقانی ۔ ۔ ۔ نظامیہ۔ خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تینوں طرزوں میں سے کس طرز پر ہے۔ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ یہ طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے خوب طرز ہے۔ اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے ہندی ہے دار الضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے ٹکسال باہر ہے۔ داد انصاف انصاف نظم۔ اگرچہ شاعران نغز گفتار ۔ ۔ ۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفیر نے "خالصاً للہ" سے "انصاف انصاف" تک کی عبارت حذف کر کے ایک دوسری عبارت درج کر دی ہے۔ غالب کا خط صفیر سے ملاقات سے پہلے کا ہے یعنی ۱۸۶۳ء (۱۲۸۰ھ) کا۔ ممکن ہے غالب نے صفیر سے اس قسم کی گفتگو کی ہو اور صفیر نے "جلوۂ خضر" کی تصنیف کے وقت اس گفتگو کو حافظے سے قلم بند کرنے کی بجائے "عود ہندی" سے نقل کر دیا ہو۔ یہ خط صفیر کی نظر میں تھا اور ایک جگہ انہوں نے اس کا حوالہ بھی دیا ہے:

"حضرت غالب نے عود ہندی میں ایک میزان درست کی ہے جس میں ان شعرا کے نتائج فکر کو دکھایا ہے۔ ۔ ۔" (جلوۂ خضر، جلد دوم، صفحہ ۹۰)۔ یہاں غالب کے مذکورہ خط ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

کا مبدع ہوا، خیالہائے نازک اور معانیٔ بلند کا۔ اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا پرواز دیا، صائب و کلیم و سلیم و قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں۔ رودگی (کذا) واسدی و فردوسی یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا، اور سعدی کی تحریر تے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں، خاقانی اس کے اقران، ظہوری اس کے امثال، صائب اس کے نظائر، اب ان میں جس کی طبیعت کو حقانیت کی طرف میلان ہو گیا۔ جس کو بظاہر عشق مجازی کا زینۂ آخر، اور حقیقی کا زینۂ اول کہہ سکتے ہیں، ان کا کیا پوچھنا اور جو مجازی میں پورے نکلے وہ بھی ان کے قدم بہ قدم ٹھہرے اور ان کے بعد کے درجے والے سب حقیقی میں ہیں۔

اگرچہ شاعران نغز گفتار　　　ز یک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں　　　خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار این قوم　　　ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ چیزے دگر حصے میں پارسیوں کے آئی ہے، ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے، جیسے میر تقی میر۔

بدنام ہو گئے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا:
دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی ان جنس گراں کو

قائم:
قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں
ہے تو ناداں، مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن:
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کمتر آتش کے یہاں بیشتر، یہ تیز نشتر ہیں، مگر مجھے کوئی ان کا شعر اس وقت یاد نہیں، میں نے التماس کیا کہ میں ان لوگوں کے شعر عرض کروں، فرمایا ہاں پڑھو۔

ناسخ:
یہی کہتا ہے جلوہ میرے بت کا
کہ اک ذات خدا ہے اور میں ہوں

جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم　　　وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں
رکھو کسی طرح تو سروکار مہرباں　　　کرتے رہو جفا ہی، وفا گر نہ ہو سکے

مر چلا ہوں امید واری میں ایسی ہاں سے وہ کرتے کاش نہیں

یہ شعر سن کر حضرت غالب نے فرمایا، ہاں ان میں بعض نشتر ہیں، پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے:

آتش: آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

دم آخر بھی بالیں پر مرے ہم راہ یار آئے
رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا

اس بلائے جان سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

سجدۂ شکر خدایا میں کئی رکھتا ہوں
قدم یار پہ ہے سر کو جھکانا شب وصل

یہ شعر سن کر فرمایا، "ان میں بھی بعض"۔

صفیر کے مذکورہ بیان کے بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:[1] "میر صفیر مرحوم کے بیان میں بعض باتیں محل نظر معلوم ہوتی ہیں:

۱- میرزا کا دبیر کو بے مثال قرار دینا اور انیس کا ذکر تک نہ کرنا۔

۲- میرزا کی غذا، اس کے متعلق حالی اور صفیر کے بیان میں بہت فرق ہے۔

۳- فارسی شاعری کی مختلف طرزوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ لفظ بلفظ میرزا کے ایک خط سے ماخوذ ہے جو اردوئے معلی میں[2] موجود ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بجنسہ انہیں الفاظ میں خیالات کا اظہار دوبارہ کیا گیا، اور جو باتیں خط کی تحریر کے وقت یاد نہ آئی تھیں وہ تقریر کے وقت بھی فراموش رہیں۔ مثلاً ناسخ و آتش کے اشعار

---

[1] "مقالہ" میر صفیر بلگرامی اور مرزا غالب، سہ ماہی "اردو" بابت جنوری ۱۹۳۶ء ص ۳

[2] جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ خط عود ہندی میں بھی شامل ہے۔

۲- میر صفیر مرحوم ناسخؔ کے شاگرد کے شاگرد تھے، لیکن ناسخؔ سے جو عقیدت انہیں تھی وہ ان سے براہ راست مستفید ہونے میں بھی کسی کو نہ ہوگی۔ جب وہ ناسخؔ کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو تقیید سے کا انداز آجاتا ہے اس لئے یہ بخوبی ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر ناسخؔ کے متعلق کچھ ایسی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہوں، جو دراصل غالب کی بہ نسبت خود ان کے ذاتی خیالات سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں۔

قاضی صاحب کا خیال درست ہے کہ صفیر کے بیان میں مندرجہ بالا امور "محل نظر" ہیں، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیس برس بعد جب وہ غالب کی باتوں کو تحریر کرنے بیٹھے تو ممکن ہے کہ ان کے حافظے نے اصل واقعات میں کچھ "رنگ آمیزی" کر دی ہو۔

تقریظ رشحات صفیر

بقول صفیر دہلی میں غالب سے ملاقات کے دوران صفیر نے اپنی کتاب "رشحات صفیر" (رسالہ تذکیر و تانیث)" کا مسودہ انہیں دکھایا۔ غالب نے "دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا" اور صفیر کو اس کی تقریظ لکھ کر دی۔ صفیر کے بیان کا دوسرا حصہ محل نظر ہے۔ یہ تو درست ہو سکتا ہے کہ صفیر نے غالب کو رسالہ تذکیر و تانیث کا مسودہ دکھایا ہو لیکن یہ درست نہیں کہ انہوں نے "تقریظ" بھی فوراً لکھ دی ہو۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو کو صاحب عالم مارہروی کی خود نوشت بیاض سے ایک خط ملا تھا جو انہوں نے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (صفحہ ۹۷) میں چھپوا دیا تھا۔ یہ خط ۲۰ر اگست، ۱۸۶۶ء کا مکتوبہ ہے۔ اس میں غالب لکھتے ہیں۔

"دیباچے کا عظیم آباد کو روانہ ہونا معلوم ہوا مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ لخت جگر و نور بصر مولوی سید فرزند احمد کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں۔"

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے دیباچہ (یا بقول صفیر تقریظ) لکھ کر صفیر کو نہیں دیا تھا، بلکہ صاحب عالم کو بھیجا تھا اور انہوں نے صفیر کو بھیجا۔ اس سلسلے میں سید برکات حسن کا بھی ایک خط ملتا ہے جو "انشائے سید گل" میں شامل ہے۔ اس میں برکات حسن لکھتے ہیں:

"... اس سے پہلے میں نے تم کو تقریظ مرزا نوشہ غالب کی بھیجی، تم نے آج تک اس کی رسید نہ لکھی اور نہ شکریہ اس کا مرزا صاحب کو تحریر کیا۔ آخر کو مرزا کا شکوہ آیا۔ برائے خدا اس منحوس عادت کو چھوڑ دو، خط کا جواب لکھا کرو۔" (صفحہ ۲۴)

ظاہر ہے کہ اگر دیباچہ غالب، صفیر خود دہلی سے لکھوا کر لائے ہوتے تو مذکورہ خطوط لکھنے کی نوبت نہ آتی۔

"رشحات صفیر" کا دیباچہ پہلے "عود ہندی" میں چھپا اور "رشحات صفیر" میں بعد میں۔ دونوں جگہ اس دیباچے میں بعض لفظی اختلافات ہیں۔ ذیل میں یہ دیباچہ "رشحات" سے نقل کیا جاتا ہے، حواشی میں "عود ہندی" (نول کشور ۱۸۶۸ء) کے اختلافات کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

"تقریظ رسالۂ رشحات یعنی کتاب تانیث و تذکیر حصۂ ہفتم مجموعۂ فیض صفیر، بقلم خاص حضرت غالب دہلوی علیہ الرحمہ۔

"سیدی سندی، نور بصر، لخت جگر،[1] قرۃ العین اسد، مولوی سید فرزند احمد کے طول عمر و دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں۔ جن کو مبداء فیاض سے اس رسالے کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ سبحان اللہ[2]۔ تفرقۂ تذکیر و تانیث کی تقریر کہ وہ اور مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے کس لطف سے ادا ہوئی ہے۔ ہر چند اس راہ سے کہ سید صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں، قواعد تذکیر و تانیث کے منضبط نہ ہونے کے خود معترف ہیں۔ لیکن قوت[3] علم اور حسن فہم اور لطف طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم[4] پہنچائے ہیں۔ مجھے دل سے پسند آئے ہیں۔ دعا ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحۂ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظور انظار[5] اولوالابصار رہے گا۔ جو صاحب اس کو مطالعہ فرمائیں گے، نفع بھی پائیں گے اور لطف بھی اٹھائیں گے۔ مولف صاحب جو کامیاب اپنے ذہن رسا سے ہیں، رئیس جلیل القدر[6] آرہ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسے ہیں، سید واسطی بلگرامی ہیں۔ یہاں کے سادات علم و فضل میں نامی اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں۔ ان حضرت کا مادح گویا اپنا ثنا خوان ہے، جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمۃ کا بیان ہے۔

مادح خورشید مداح خود است
کہ مرا دو چشم سر تا مر مداست[7]

داد کا طالب غالب ۔۱۲ (مہر غالب) محمد اسد اللہ خان ۱۲۸۳ھ

یہ دیباچہ رشحات کی طبع ثانی (۱۳۰۲ ہجری) میں شامل نہیں، رشحات کی طبع اول میں حضرت صاحب عالم مارہروی

---

[1] عود: "نور بصر و لخت جگر"

[2] عود: ۔ سبحان اللہ تانیث تذکیر کی تقریر۔ ۔ ۔

[3] عود: ۔ قوت علم و حسن فہم و لطف طبع

[4] عود: ۔ ۔ ۔ بہم پہنچاتے ہیں کہ اور صاحبوں کے دل کی دوسرے کو کیا خبر مگر مجھے تو دل سے ۔ ۔ ۔

[5] عود: ۔ نظر

[6] عود: ۔ ۔ ۔ جلیل القدر عظیم آباد و آرہ اور ۔ ۔ ۔

[7] کہ دو چشم روشن و نا مرمد است (مثنوی معنوی مرتبہ نکلسن، لیڈن، ۱۹۳۳ء، دفتر پنجم، صفحہ ۲)

کی تقریظ بھی شامل ہے، اس تقریظ میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

"ملک الشعرائے ہندوستان، استاد ہمہ دان دقائق فارسی و ہندی زبان، نواب محمد اسد اللہ خان صاحب غالب تخلص نے تقریظ اس پر قلمی فرمائی، قدر و منزلت مولف و تالیف بڑھائی۔ بعد تحریر خدمت موصوف کے حاجت و ضرورت دوسری تحریر کی کب ہے۔"

غالب و صفیر کے تعلقات کی داستان بظاہر یہاں ختم ہو جاتی ہے، لیکن بالواسطہ تعلق ابھی قائم رہتا ہے۔ ۱۲۸۳ ہجری میں صفیر کے ہاں لڑکا پیدا ہوا[1]۔ چودھری عبد الغفور سرورؔ نے دو قطعات تاریخ لکھے اور غالب کو اصلاح کے لئے بھیجے غالب نے نہ صرف یہ کہ ان کی اصلاح کی بلکہ "دوسرا قطعہ انہیں پسند نہ آیا اور سراسر تکلفات بارده، لہٰذا انہوں نے پورا قطعہ قلم زد کر دیا، لیکن اپنے دوست اور شاگرد کا دل رکھنے کے لئے ایک اردو قطعہ جیب خاص سے مرحمت بھی کر دیا ہے"[2] غالب کا "عطا کردہ" قطعہ یہ ہے:

پور وہ فرزند احمد کو ملا　　رحمت باری کا جو گنجینہ ہے

سال تاریخ ولادت یوں لکھا　　راحت جان ہے سرور سینہ ہے

قطعات کی اصلاح کے ساتھ غالب نے سرور کے نام ایک خط بھی لکھا۔ یہ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۶ء کا مکتوب ہے اس میں وہ لکھتے ہیں: "۔۔۔ آرہ میں مولوی سید فرزند احمد کے مکان کا پتہ لکھ بھیجو تاکہ میں ان کو تہنیت لکھ بھیجوں۔" اس سے ڈاکٹر مختار الدین نے یہ نتیجہ نکالا ہے:۔ "ستمبر (دسمبر؟)، ۱۸۶۶ء سے صفیر و غالب کی باقاعدہ خط و کتابت کی ابتدا ہوئی ہے، اس سے پہلے ممکن ہے، حضرت صاحب عالم یا سرور کے خطوں میں وہ دعا و سلام بھیج دیتے ہوں یا مارہرہ ایک آدھ خط انہوں نے لکھا ہو، لیکن اس وقت انہیں آرہ میں صفیر کے مکان کا پتا معلوم نہ تھا۔"[3]

یہ بیان محل نظر ہے، اس لئے کہ غالب و صفیر کی خط و کتابت ۱۲۸۰ ہجری سے شروع ہوئی تھی اور غالب کا آخری خط ۷ ذی الحجہ، ۱۲۸۱ ہجری کا ملتا ہے۔ رہی یہ بات کہ غالب نے صفیر کا پتا دریافت کیا تھا تو ممکن ہے کہ سرور کو خط لکھتے وقت انہیں صفیر کا پتہ یاد نہ رہا ہو ورنہ آرہ کے پتے پر ان سے صفیر کی خط و کتابت رہ چکی تھی۔ مکتوب غالب

---

[1] صفیر کے فرزند کا نام سید نور احمد تھا۔ پیدائش ۹ ربیع الثانی، ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۸۶۶ء وفات، ۲ محرم ۱۳۱۶ھ مطابق (جون ۱۸۹۸ء) سید علی احمد بلگرامی انہیں سید نور احمد کے فرزند ہیں۔

[2] مقالہ "غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط اور چند اصلاحیں" از مختار الدین آرزو مطبوعہ ماہنامہ "آج کل" بابت فروری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴

[3] "　"　"　"　"　"　"　"　"　"

بنام سرور کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کی صفیر سے دوبارہ مراسلت ۱۸۶۶ء میں شروع ہوئی ہوگی۔ لیکن ابھی تک غالب کا کوئی ایسا خط (بنام صفیر) دستیاب نہیں ہوا جو ۱۲۸۱ھ کے بعد کا ہو۔

یہاں تک صفیر و غالب کے باہمی تعلقات کی داستان بیان کی گئی ہے اب ذیل میں صفیر کی مختلف تصانیف میں غالب سے متعلق ایسی تحریروں کو یکجا کیا جاتا ہے، جن سے غالب کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ یا غالب کی شاعری کے بارے میں صفیر کی رائے معلوم ہوتی ہے۔

انشائے سیدِ گل

اس کتاب کی تفصیل اس مقالے کی ابتدا میں لکھی جاچکی ہے اور اسکے حوالے سے خطوط غالب بنام صفیر درج کئے جاچکے ہیں۔ اب چند ایسے مکتوبات پیش کیے جاتے ہیں جن میں غالب کا ذکر ہے ان خطوط سے غالب کے آخری زمانے کے حالات پر روشنی پڑتی ہے:

مکتوب صاحب عالم صاحب سجادہ نشیں مارہرہ، بنام صفیر

"حال و اضمحلال مرزا نوشہ صاحب کمال ملال داد۔ او تعالیٰ در عمر و صحت شان بیفزاید۔ شنیدہ ام کہ اگر ان سمی دوات و قلم نزد شان می باشد۔ مردمان کہ برائے ملاقات می روند، حالات خود را تحریر کردہ می دہند۔ جواب زبانی یا قلمی می یابند۔ برخوردار ان مقبول عالم و سید آل محمد و سید برکات حسن رفتہ دیدہ آمد . . ." (صفحہ ۶)

صفیر نے اس کے جواب میں لکھا:

"احوال جناب غالب مدظلہ از اشتہار شان کہ طبع شدہ مشتہر گردیدہ معلوم شد و تحسر بر تحسر افزود حالا زمانہ شان آخراست خداوند تعالیٰ از قدرت کاملہ خود دریں پیرانہ سری توتے بخشد کہ از باقی ماندگان ہند و مغتنم زمانہ ہستند۔ عریضۂ بخدمت شان روانہ کردہ ام۔ تا جواب چہ آید۔" (صفحہ ۷)

صفیر نے غالب کے نام جو خط لکھا ہوگا، اس کا جواب شاید نہیں آیا۔ ورنہ صفیر اسے بھی شائع کردیتے سید مقبول عالم غالب سے اپنی ملاقات کا حال صفیر کے نام ایک خط میں، ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

". . . نیمۂ شوال خیر مآل گذشتہ، راقم آثم را معہ برادر صاحبان سید آل محمد صاحب و سید برکات حسن صاحب بہ پیش آمد تقریب سفر میرٹھ از مارہرہ حرکت داد۔ غلطم، مایان کجا و چرا می رفتیم۔ علت غائی استحصال ملازمت جناب غالب بود، فدای ماسہ برادر عزیزی مظہر علی نبیرۂ بالامیاں صاحب مرحوم از کمال اشتیاق مرزا صاحب ترک روزگار کردہ، با ماہم باشد، القصہ ـ برفتیم قاصد بدیدار مرد

مگر افسوس چنانکہ جسم با جان و چشم نگران و زبان جنبان یافتیم از . . . [1] مرزا صاحب چہ خبر دہم۔ سامعہ

---

[1] ایک لفظ کتاب کے کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے واضح نہیں۔

مفقود، حافظہ نابود، قوائے حساسہ معطل، دماغ مختل، پریشے اختراری بانطباع دادہ اند عنوان آن باین شعر نہادہ اند:

دیگر از خویشتم خبر بنود تکلف برطرف
این قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ملاقتی کہ از دیدن میر امامی عون صاحب و قبلہ مغفور برداشتہ بودم ہمان و ہمچنان از ملاقات مرزا صاحب کا حاصل دکمال تاسف بدل وجان واصل شد۔ بخدمت نانا صاحب شما بیتے نوشتہ فرستادہ اند کہ ہرگاہ داعی اجل را لبیک گویم این بیت را بند قرار دادہ ترجیع بند فرمایند۔ این است:

رشک عرفی و فخر طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

چہار روز اتفاق قیام دہلی افتاد، ہر روزہ بخدمت مرزا صاحب حاضر می شدم و از اشفاق و اخلاق چہ شرح رود با این ہمہ ناتوانی و نیم جانی چندان مبذول می فرمودند کہ خاطر ترک مجالست را نمی خواست و پا برنمی خاست وقت رخصت بجا نبین کلال و ملال دست داد۔ لطایف و ظرایف این حالت نیز شنیدنی است انشاء اللہ تعالیٰ از زبان برادرم سید آل محمد صاحب اصغا خواہد شد۔ آں عزیز را ہر چہ از نتائج افکار گہر بار درین عرصہ بعد از آمدن جہاں خان فراہم شدہ باشد، بہ ہمراہی برادرم حاجی عبداللہ صاحب لطف کردنی است (صفحہ ۸۰)

صفیر اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔ سیر دہلی و ملاقات حضرت غالب مدظلہ حسرتم بمن داد۔ کاش من ہم سایہ آسا ہمراہ می بودم و درین وقت ہم زیارت حضرت غالب می کردم۔ حیف استادے کہ از باقی ماندگان ہند بود مرحلۂ آخر می پیماید۔ خداوند تعالیٰ بر نیم جانیش بخشاید۔ شکر دم غنیمت است[1]" (صفحہ ۸)

"انشائے سہدگل" میں صفیر نے اپنی اور غالب کی مراسلت کے درمیان غالب کے دو خط میر ولایت علی کے نام درج کئے ہیں۔ میر موصوف مطبع عظیم المطابع کے مالک تھے، جہاں سے صفیر کا ترجمہ بوستان خیال چھپا تھا، افسوس کہ کتاب کے کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے خط کے ابتدائی حصے کے بعض الفاظ پڑھنے میں نہیں آتے۔ ایسی جگہوں پر نقطے لگا دیئے ہیں، ایک جگہ کتاب ہی میں نقطے لگے ہیں، یہاں "کذا" لکھ دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود صفیر نے اس خط کے بعض الفاظ حذف کر دیئے تھے۔ اس خط پر یہ عنوان ہے۔ "خط حضرت غالب بنام میر ولایت علی مہتمم مطبع بھی لطف سے خالی نہیں" یہ خط پہلی مرتبہ منظر عام پر آ رہا ہے۔

---

[1] چند الفاظ کتاب کے کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے واضح نہیں ہیں۔

غالب کا ایک نایاب خط (۷)

"...شفیق مکرم میر ولایت علی صاحب کو خدائے جہاں آفریں... (تندرست) رکھے۔ ازروئے اودھ اخبار لکھنؤ بوستان خیال کا ترجمہ مسمی بہ پرستان (خیال) آپ کے مطبع میں آمادہ انطباع بلکہ دو جلدوں کا منطبع ہوجانا اور دونوں نسخوں کا بہ قیمت لله عہ ۱۲ر کے بشرط ارسال محصول ڈاک ہاتھ آنا معلوم (ہوا) - ۲ ٹکٹ ... مالیت دو روپیہ کے بھیجتا ہوں - پونے دو روپے قیمت کے اور چار آنے ازروئے قیاس محصول کے ... (کذا) فقیر کو آج یہ حال معلوم ہوا، آج ہی خط معہ محصول روانہ کیا۔ آپ سے مستدعی بلکہ متقاضی ہوں کہ اسی طرح آپ بھی عجلت کو کام فرمایئے اور جس دن میرا خط پہنچے، اس کے دوسرے دن پارسل روانہ کیجئے، صورت تعجیل میں شکرگزار اور صورت توقف میں گلہ سنج رہوں گا - ۸ ذیقعدہ"۔

[مہر: محمد اسد اللہ خان، ۱۲۳۸ (کذا)] (صفحہ ۱۵-۱۴)

یہ خط ۱۲۸۱ ہجری کا ہے، اسی روز غالب نے صفیر کے نام بھی ایک خط لکھا تھا، جو صفیر کے نام خطوط میں درج کیا جاچکا ہے غالب، میر ولایت کے نام کے لفافے میں ٹکٹ رکھنے بھول گئے تھے، لہٰذا دوسرے دن دوبارہ انہوں نے ایک اور خط لکھا۔ "انشائے سبد گل" میں اس کا عنوان یہ ہے "پرچہ ثانی حضرت غالب بنام میر صاحب موصوف مشعر اعتذار"

مکتوب غالب (۸)

جناب میر ولایت علی صاحب، واسطے اپنے جد کے میری تقصیر معاف کیجئے اور حقیقت میں میرا گناہ نہیں:

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

ستر برس کی عمر، حافظہ معدوم، نسیان مستولی، کل آپ کو خط لکھا، لفافہ کرتے وقت ٹکٹ لپیٹنی بھول گیا، آج جو بکس کھولا تو ٹکٹ بکس میں باقی، ذلیل و خوار و خجل و شرمسار، آج لفافہ جدید میں ملفوف کرکے بھیجتا ہوں - خدا کرے پہنچ جائیں - ۹ ذیقعدہ، غالب یک رنگ" (صفحہ ۱۵)

یہی خط اس سے پہلے "رشحات صفیر" (طبع دوم صفحات ۵۱-۵۰) میں چھپ چکا ہے - اسے یہاں "ٹکٹ" کی تانیث کے ثبوت میں پیش کیا گیا - رشحات میں اس خط کا متن مذکورہ متن سے قدرے مختلف ہے، ذیل میں رشحات کے متن کے مختلف الفاظ درج کئے جاتے ہیں، مشترک الفاظ کی جگہ نقطے لگائے گئے ہیں:

خط حضرت غالب علیہ الرحمتہ بنام میر ولایت علی بطلب بوستان خیال صفیر بلگرامی

"...صاحب مہتمم مطبع عظیم المطابع عظیم آباد، واسطے... کیجئے در حقیقت میرا گناہ نہیں... حافظہ معلوم (کذا) کل آپ کو بطلب ترجمہ بوستان خیال مترجمہ صفیر بلگرامی خط لکھا... بکس کھولا، ٹکٹ بکس... خدا کرے کتاب وہاں

سے پہلے روانہ ہوا اور یہ لفافہ وہاں بعد پہنچے۔ ۱۲ نجات کا طالب غالب۔ ۱۶ اپریل ۱۸۶۵ء"

قاضی عبدالودود نے یہ خط "آثار غالب" (علی گڑھ میگزین غالب نمبر، صفحہ ۲) میں شامل کیا ہے۔ اس کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں:

"میر ولایت علی کے نام کا خط فیض صفیر (رشحات صفیر) کی اشاعت ثانی سے ماخوذ ہے۔ غالباً اشاعت اول میں یہ خط نہ تھا اور فیض صفیر کا جو خلاصہ حال میں چھپا ہے اس میں بھی یہ خط شامل نہیں۔ صفیر بلگرامی نے اس خط کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ ٹکٹ مونث بھی ہے، لیکن مجھے جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ اس سے ٹکٹ کی تانیث ثابت نہیں ہوتی۔ (خط بنام راقم) میر ولایت علی سے متعلق تحقیقات سے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی، اور نہ اس خط کا پتہ چلا[1] جو اس سے پہلے غالب نے میر ولایت علی کو لکھا تھا۔ اس خط کا لفافہ البتہ (کتب خانہ مشرقی بانکی پور میں) محفوظ ہے۔ اس پر یہ عبارت مندرج ہے! "در عظیم آباد پٹنہ، بہ محلہ کشمیری کوٹھی مطبع عظیم المطابع موصول و بہ خدمت جناب میر ولایت علی صاحب مہتمم مطبع مذکور عزاد مجدہ، مقبول باد۔ پیڈ مزدوری جواب طلبیدہ" لفافے پر مہر بھی ہے جس کا نقش "غالب ۱۲۷۲ھ" ہے۔ اس لفافے کا عکس ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اس مقالے کے ساتھ شائع کیا ہے، جس کا عنوان غالب کے لفافے ہے اور جو اپریل ۱۹۳۴ء کے ہندوستانی میں چھپا ہے۔ صفیر بلگرامی جلوۂ خضر جلد ا (صفحہ ۲۴۲) میں لکھتے ہیں کہ "جب میں نے بوستان خیال کو اردو کر کے اس کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا، حضرت غالب نے ایک خط وجہ اس کی قیمت کے میرے پاس پٹنہ بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی"۔ یہ اسی[2] خط کی طرف اشارہ ہے، گو مکتوب الیہ میر ولایت علی ہیں۔ بوستان خیال مترجمہ صفیر کی ایک جلد میں نے لڑکپن میں دیکھی تھی، اس وقت باوجود تلاش نہ مل سکی غالباً اور جلدیں نہیں چھپیں بلکہ یہ بھی یقین نہیں کہ صفیر نے اور جلدیں بھی ترجمہ کی تھیں" (صفحہ ۲۴)

قاضی صاحب نے بوستان خیال کے ترجمے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے سلسلے میں عرض ہے کہ صفیر بلگرامی نے "بوستان خیال" کا ترجمہ "بوستان خیال" کے نام سے کیا تھا، ۱۲۸۰ ہجری اور ۱۲۸۱ ہجری میں اس کے دو "پہروں" (یا جلدیں) یکے بعد دیگرے "صبح خنداں" اور "چمنستان" کے نام سے چھپے تھے۔ "صبح خنداں" کے خاتمے میں صفیر لکھتے ہیں:

"بعض احباب یہ سمجھتے ہیں کہ عاصی نے بوستان خیال کو انتخاب کیا ہے کہ اٹھارہ جلد دن کو دس جلدوں میں

---

[1] یہ خط اوپر درج کیا جا چکا ہے۔

[2] یہ درست نہیں، اس سلسلے میں غالب نے صفیر کو بھی ایک خط لکھا تھا جو اس مقالے میں درج کیا جا چکا ہے۔ صفیر نے اپنے نام کے اسی خط کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لکھا ہے۔ یہ غلط ہے، بلکہ ایک جلد مسمی بہ پردۂ اعظم اور افق الخیال ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد یہ جلد صبح خندان اور پردۂ اوّل ہے یہاں سے شاہ زادے کا حال آغاز ہے اور تا بہ پردۂ ہشتم کہ مسمی بہ شام وصال ہے، اختتام ہے۔ اس حساب سے دس جلدیں ہوئیں۔ اس میں کوئی حال چھوٹا نہیں۔" (صفحہ ۱۱۶-۱۱۵)

افق الخیال، صبح خندان اور چمنستان، ابتدائی تین جلدیں ہیں جن میں سے دو چھپ چکی ہیں۔ آخری "شام وصال" ہے۔ باقی جلدوں کے نام یہ ہیں: صبح بہار، چشمۂ خضر، حباب رعنا، طلسم اعظم، فروغ نظر، ساغر لبریز۔ بوستان خیال کی تمام غیر مطبوعہ جلدوں کے قلمی مسودے جناب سید صبیح احمد بلگرامی کے پاس محفوظ ہیں۔

"انشائے سبد گل" میں ایک اور جگہ غالب کا ذکر ملتا ہے۔ سید آل محمد مارہروی کے خط کے جواب میں صفیر ایک فارسی غزل بھیجتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"حضرت غالب مد ظلہ رام پور تشریف لے گئے تھے۔ خدا جانے آئے یا نہیں۔ اگر آنے کی خبر ہو تو نانا صاحب کے خط کے ساتھ یہ غزل اصلاح کے لئے بھیج دیجئے۔" (صفحہ ۴۲)

اس خط پر تاریخ نہیں ہے، لیکن غالب کے سفر رام پور کی تاریخوں کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط ۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ء مطابق (۲۰ شعبان ۱۲۸۲ ہجری) کے درمیان لکھا گیا ہوگا۔

جلوۂ خضر۔ جلد اوّل

صاحب عالم مارہروی کا حال لکھتے ہوئے، غالب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

"۔ ۔ ۔ حضرت غالب علیہ الرحمہ کو ان کے ساتھ ارادت خاص تھی۔ پنج آہنگ اور اردوئے معلی اور عود ہندی میں ان کے نام کے مکتوب اور رقعات بہت ہیں۔ شعر و سخن کی بحث غالب سے اکثر رہا کرتی تھی۔ انہیں کی تحریک سے مولف ۱۲۸۳ ہجری میں حضرت غالب کے پاس دہلی گیا اور شاگرد ہو آیا۔" (صفحہ ۲۰۰) جلد اوّل کے آخر میں اساتذہ دہلی کے کلام سے محاورات دہلی درج کئے ہیں۔ اس ضمن میں "معذرت" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

"۔ ۔ ۔ میں غالب علیہ الرحمہ کا شاگرد ہوں مگر چوں کہ وہ بھی دہلی کی زبان پابند تھے اس لئے ان کے کلام میں بھی جو صاف محاورہ لکھنؤ ہیں، لکھے جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اگرچہ حضرت غالب نے اکبر آباد کے مطبع اموں جان میں اپنے دیوان کے خاتمہ پر ایک معذرت چھپوا بھی دی ہے کہ "میرے کلام میں جو الفاظ اور محاورے ناقص بندھ گئے ہیں، میں کیا کروں دہلی کی زبان ہی ایسی ہے۔ میں بھی ان کو پسند کرتا ہوں"۔ (صفحہ ۲۸۹)

اس کے بعد "محاورات دہلی" سے متعلق سات اشعار ہیں اور پھر صفیر لکھتے ہیں:

"واضح ہو کہ حضرت غالب کے کلام میں ایک تو محاورات دہلی بہ سبب بندش و ترکیب فارسی کے بہت کم ہیں اور اگر ہیں بھی تو وہ خود ان کو ناپسند کرتے تھے، چنانچہ اکبر آباد کے مطبع اموجان میں جو ان کا دیوان چھپا ہے، اس کے خاتمے

میں اس کی معذرت چھپوائی ہے۔" (صفحہ ۲۹۰)

جلوۂ خضر۔ جلد دوم:

ناسخ کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے صفیر لکھتے ہیں:

میرے برادر گرامی قدر حضرت سید برکات حسن[1] صاحب بن حضرت سید محمد امیر صاحب سجادہ نشین مارہرہ جب غالب علیہ الرحمہ کی ملاقات کو دہلی گئے اور حضرت نے کچھ اپنا کلام سنایا، اس مقطع کو بھی پڑھا۔

ضعف نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

حضرت برکات حسن نے کہا، دیوان میں تو "عشق نے غالب نکما کر دیا" لکھا ہے۔ فرمایا، یہ عشق کا لفظ اسی زمانے کے واسطے تھا اب اس لفظ سے شرم آتی ہے۔ (صفحہ ۶۰)

غالب کی نثر کے بارے میں صفیر لکھتے ہیں:

"تاثیر ور نثر کے موجد اردو میں اول استاد تا حضرت غالب علیہ الرحمہ گنے جاتے ہیں کہ انہوں نے بعد ترک تحریر فارسی اردو میں خط لکھنے کی وضع ایسی نکالی کہ گویا مکتوب الیہ سے باتیں کرتے ہیں۔" (صفحہ ۲۰۲)

صفیر نے اپنے حالات میں سید بندہ رضا بلگرامی کا ایک خط درج کیا ہے، جس کی مندرجہ ذیل عبارتیں غالب سے متعلق ہیں:

"آپ کو اور جناب قدر[2] کو مرزا غالب کی محبت نے ایسا مجبور کر رکھا ہے جیسا قوم نصیری کو حب علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے عالاں کہ میرا بھی اعتقاد ہے کہ مرزا غالب صاحب فارسی میں اکثر اہل ہند سے بہتر ہیں مگر اردو میں تو ایک مبتدی لکھنؤ کے مقابل بھی نہیں

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

قابل ملاحظہ اور انصاف طلب ہے۔ ۔ ۔ مجھ کو یہ بھی آپ کی اور جناب قدرؔ کی طرف سے اب احتمال ہے عجب نہیں کہ مرزا صاحب مرحوم تاریخ بلگرام میں بھی کسی نہ کسی پیرایے سے داخل کر دیئے جائیں۔ میری اس رائے ناقص سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ مرزا غالب صاحب کا غیر معتقد ہوں، مگر بمقابلہ لکھنؤ کے دلی والوں کو میں ضرور ناقص

---

[1] حاشیہ صفیر: یہ مولف کے بہنوئی ہیں اور مولف کے چھا جمیر کے بھانجے ہیں۔ ان کے بزرگ سینکڑوں برس سے سجادہ نشین قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ ہوتے آئے ہیں۔ ان کے برادر بزرگ حضرت سید محمد حسن صاحب اپنے والد کے مقام پر سجادہ نشین ہیں۔ ۔ ۔

[2] قدر بلگرامی جو صفیر کے قریبی عزیز اور غالبؔ کے شاگرد تھے۔

سمجھتا ہوں ۔ ۔ ۔ (صفحات ۹۰-۱۸۹)

صفیر نے اس خط کا جو جواب لکھا تھا وہ بھی دستیاب ہو چکا ہے ۔ یہ خط سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے رسالہ "آج کل" دہلی بابت فروری ۱۹۵۸ء میں چھپوا دیا ہے ۔ صفیر کے خط کا وہ حصہ جو غالب سے متعلق ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے ، بندہ رضا بلگرامی کا خط ۱۸ رمئی ۱۸۸۳ء کا تھا ، صفیر کا جواب ۷ رجون ۱۸۸۳ء کا ہے ۔

"میری تحریر جو اساتذہ کے باب میں ہے یا ایسی ایسی باتوں میں جو میری رائے ہے نہ ابھی آپ نے دیکھی نہ سنی میں اپنے ہوش کے وقت سے کبھی ایسے کا شاگرد نہیں ہوا جس کو سمجھ نہ لیا ہو ۔ محبت اور چیز ہے ، اور سمجھ اور چیز ہے میں نے جو غالب کو سمجھا ہے ، حقاً اور ایماناً بیان کرتا ہوں ۔ علم عربی میں تو ان کو محض نا آشنا جانتا ہوں ۔ مگر بزور فارسی ان میں ضروری واقفیت کا قائل ہوں ۔ فارسی میں ان سے بڑھ کر کسی شاعر ہند کو فارسی گو نہیں سمجھتا ۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟ سنیئے ۔ ہندوستان میں یہی نامی شاعر ہوتے ہیں ۔ (۱) خسرو (۲) بیدل (۳) آرزو (۴) قتیل (۵) مظہر جان جاناں ، (۶) فقیر ، (۷) حسن اور (۸) غالب ۔

ان کے سوا غنی کشمیری تھے ، واقف لاہوری تھے ، علی سرہندی تھے اور فیضی ۔ ۔ ۔ شاعر خاص ہندوستانی تھے ۔ ان میں سے خسرو ، فقیر ، حسن ، ایک پایہ کے ہیں ۔ اور آرزو ، قتیل ایک سرمایہ کے ۔ اور بیدل ، مظہر غالب ایک پایے کے ہیں ۔ مگر خسرو اور حسن دہلوی اس وضع کے شاعر تھے جو وضع سعدی کے پہلے تھی ۔ جس کو ابو الفضل نے متروک اور ناپسند لکھا ہے ۔ وہ لوگ عرفان مآب تھے ، شاعر نہ تھے ۔ بلند نام اور عالی مقام تھے ، شاعر نہ تھے ۔ آرزو ، قتیل ، نہ الاالذی نہ الاالذی ۔ ۔ ۔ مگر ان کی معلومات کا قائل ہوں ۔ نہ ان کے مذاق شاعری کا ۔ بیدل ، مظہر ، غالب یہ تینوں بہادران میدان سخن تھے ۔ بیدل اور مظہر نے مضامین عارفانہ کو مذاق شاعرانہ سے ملا کر جیسا کہا ہے دل لوٹا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

غالب جنت آرام گاہ کہ خاتم الشعرای فرس ہندوستان میں ہوتے ہیں ان کی درخشانی طبع نے آخری مادہ میں ہندوستان کا نام روشن کر دیا ۔ کلام فارسی ان کا مشہور اور زبانوں پہ مذکور ہے ۔ چند شعر مثالاً لکھے جاتے ہیں ۔

اے زساز زنجیرم ہمہ جنوں ، نوا گر کن
بندگر بدین ذوق ست پارہ گرانی ترکن

جنوں مستم بہ فصل نو بہارم می توان کشتن
صراحی در کف و گل در کنارم می توان کشتن
بہ جرم این کہ در مستی بیابان بردہ ام عمرے
بہ کوئے مے فروشان در خمارم می توان کشتن

بہ ہجران زیستن کفر است خوئم را دیت بنود
چراغ صبح گاہم آشکارم می توان کشتن

خضر ست و خدا داور و ہنگامہ بپایاں
اے شکوۂ بے مہری احباب کجائی

خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم
تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

یہ حقیقت شعرائے فارسی گو ہندوستان کی تھی ۔ اب ان لوگوں میں سے سب نے اردو شعر کہے ہیں، مگر وہ ابتداً تھی تفریحاً اور تفنناً کہنے کا اتفاق ہوا ۔ اور غالب کہ آخر میں ہوئے، انہوں نے زمرۂ شعرائے اردو میں گنجائش کی اور اردو شاعری یہ طرزِ خاص کی ۔ اور طرزِ خاص کی وجہ یہی ہوئی جو ناسخ کا کلام دیکھ کر اہل دہلی کے لئے واقع ہوئی ۔ مگر سب میں غالب نے جو طرزِ بیان ایجاد کی بہ نسبت اوروں کے سہل اور صاف ہے ۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ فارسی ترکیب کے شعر کہے اور اس میں فعل و حروف اشارہ فقط ہندی رکھے ۔ جیسے "کاوِ کاوِ سخت جانی ۔ ۔ ۔ نہ پوچھ" کی جگہ "مپرس" ہوتا تو ۔ فارسی کا مصرع صاف تھا ۔ بخلاف مومن خان کے کہ ان کے مصرعے ایسے پیچیدہ الفاظ تعقید و تعقید سے مملو ہوتے ہیں کہ جس سے مضمون میں پیچیدگی آجاتی ہے ۔ غالب کے یہاں یہ نہیں ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آخری عمر میں غالب نے محاورات اور سلاست کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی فارسی کا مذاق چھپا چھپا ایسا رکھا ہے کہ دل کو لبھا لیتا ہے مثلاً چند شعر دونوں طرز کے لکھتا ہوں :

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

نمونۂ دوم:

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہو شباب میں

تو ہم لوگ غالب کو اچھا اس سبب سے سمجھتے ہیں کہ طرزِ بندش اور صفائی بیان میں سب شعرائے دلی سے اعلیٰ اور زبان فارسی میں یکتا تھے یہاں میں مثالاً ذوق، مومن، غالب کا کلام لکھتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ غالب میں صفائی کیسی ہے۔ اور ان دونوں میں گنجلک کیسی :

ذوق

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے

سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

غالب

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

ہیا

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا

اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

مومن

ذرا کم زور سینے پر کہ تیرِ پُر ستم نکلے

جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

باقی رہی زباں دانی۔ ان کے سوائے چند محاورات خاص دہلی کے جس کے خود مرزا غالب قائل ہوئے ہیں۔ چہ غالب، چہ مومن، چہ نصیر وغیرہ سب دہلوی اور سب لکھنوی، کہیں کے رہنے والے ہوں بشرطیکہ انہوں نے لکھنو یا دہلی میں نشو و نما پائی ہو اور اساتذہ کے خاندان سے منسوب ہوں اول درجہ کے ہیں اور دوسرا محاورات میں درجہ عوام و خواص کا ہے۔ اور تیسرا درجہ بازاریوں کا ہے۔

اور شہروں کے اعلیٰ ترین خواص . . . اور بازاریوں کے تقابل نہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور یہی رائے انشاءاللہ خاں کی بھی ہے۔ مگر یہ بات فقط دہلی و لکھنؤ کے واسطے ہے۔ یہ سبب اجتماع اہل علم و فن کے۔ ایسی حالت میں قصباتی یا دوسرے شہر کے رہنے والوں کو تمام اہل دہلی و لکھنؤ کی تقلید جائز ہے مگر کسی بات میں محاورے اور تذکیر و تانیث میں جب تک اختلاف ان میں نہ ہو اور جس محاورے و تانیث و تذکیر میں اختلاف ہو

اس میں سے اسی محاورے کو ماننا چاہیئے جس مقام کی تقلید اسے پسند ہو۔ یعنی لکھنؤ کی یا دہلی کی۔ مگر حالیؔ نے کیا خوب کہا ہے:

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح　　　　اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم　　　　لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے　　　　ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالب نکتہ داں سے کیا نسبت　　　　خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نئے خزانے

ابو سلمان شاہجہان پوری

تشام الحق تھانوی، مولانا	مرکزی جمعیۃ العلماء اسلام اور نظریۂ پاکستان ؎	سنڈے مشرق کراچی ۲ر نومبر ۱۹۷۰ء ص ۳
سان، محمد حسین	قیام پاکستان کا مقصد کیا ہے ؟	جسارت کراچی ۳۰ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۹
مد اللہ، خواجہ	جب تحریک پاکستان شباب پر تھی	زندگی لاہور، ۱۰ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۴ تا ۱۸
رار احمد، ڈاکٹر	اسلام اور پاکستان۔ کچھ ناخوشگوار واقعات اور تلخ حقائق	میثاق، لاہور اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۱ تا ۴۰
تیاق حسین قریشی	پاکستان کا تخیل	پاک ڈائجسٹ لاہور، ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۴۱ تا ۵۸
ضال قادری، ڈاکٹر محمد	تحریک پاکستان میں علی گڑھ یونیورسٹی کا حصہ	جنگ کراچی ۲۲ اگست ۱۹۷۰ء ص ۵
بال اسد	تصور پاکستان کا آغاز	حریت کراچی ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء ص ۳
ب قادری، پروفیسر محمد	جہاد ہنومان گڑھی	البلاغ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۱۴ تا ۲۵
تاب حسن، میجر	کچھ یادیں کچھ باتیں۔ ستارخیری اور تقسیم ہند کی تجویز ۱۹۱۷ء	حریت کراچی ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء ص ۴
راحمد، میاں	اسلامی ہند میں بیداری اور تشکیل پاکستان	پاک جمہوریت، لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۲۹ تا ۳۰
گیر، صاحبزادہ اثیر الدین احمد	آزاد ہند فوج۔ تاریخی پس منظر میں	آجکل کراچی، ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۴۳
" "	" " "	" ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲۹ تا ۳۰
ہدری، پروفیسر جی ڈبلیو	مطالعۂ پاکستان کا حقیقی پس منظر	حریت کراچی ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء ص ۳
" "	ہم نے آزادی کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دیں	جنگ کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۰

؎ یہ مولانا احتشام الحق تھانوی کی ایک تقریر کی آخری قسط ہے۔

حسن مثنیٰ ندوی	پاکستان مخالفین کی نظر میں	مہر نیمروز، کراچی اگست ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۵ تا ۴
حسن نظامی، خواجہ	۱۸۵۷ء کا ایک المیہ	المنبر لائل پور ۴ دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۶۔
حمیدہ اعظم ایم۔اے	برصغیر میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا مسئلہ	جسارت کراچی ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۲
خلیق قریشی	پاکستان کا مقصد اول	نوائے وقت، لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۲
خلیق قریشی	تحریک پاکستان کے بارے میں مستند کتابیں مرتب کرنے کی ضرورت	مشرق، لاہور ۱۱ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۳ مشرق، لاہور ۱۱ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۳
ریاض الحسن، ڈاکٹر محمد	تحریک پاکستان میں ڈاکٹروں کا کردار	مشرق لاہور ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء ص ۵
زبیر سپرا، محمد	پاکستان کا مطلب۔ بیگم سلمیٰ تصدق حسین سے ایک انٹرویو،	پاک جمہوریت، لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۷ تا ۸
سلیم ہاشمی، محمد	تحریک پاکستان اور متضاد عناصر	جنگ کراچی ۲۶ ستمبر ۱۹۷۰ء
شریف المجاہد	ہماری آزادی کی مختصر تاریخ	حریت کراچی ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء ص ۲
ظفر فاروقی	راجہ صاحب محمود آباد سے۔ ذرا سنئے	تہذیب الاخلاق اگست ۱۹۷۰ء ص ۴۴ تا ۵۵
ظفر اللہ خاں، چودھری سر	پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ (خود نوشت سوانح حیات کا ایک باب)	لاہور۔ لاہور ۱۰ اگست ۱۹۷۰ء ص ۵ تا ۷
ظہور الحق	فرائضی تحریک آزادی	پاک جمہوریت، لاہور ۲۴ جولائی ۱۹۷۰ء ص ۷، ۴
عبدالرحمٰن خاں، منشی	نظریۂ پاکستان کا پس منظر	مشرق لاہور ۲۴ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۳
" "	" " " (۲)	ندائے ملت ۸ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۲
عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر	برعظیم کے مسلمانوں میں علیحدہ وطن کا تصور کیوں پیدا ہوا	امروز لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۴
فرحت شاہجہان پوری	پاکستان کا مقدمہ جیتنے کا سہرا	مشرق لاہور ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء ص ۲
فضلی، فضل احمد کریم	پاکستان میں قومیت اور وطنیت کا مغربی تصور	مشرق لاہور ۳۰ اگست ۱۹۷۰ء ص ۳
فیروز حسن، خواجہ	ایک تاریخ ساز دن۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء	مشرق لاہور ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء ص ۸
فیض محمد سومرو مترجم: م۔ح۔ا	تحریک آزادی میں سندھ کا حصہ	پاک جمہوریت، لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۲۱
مجاہد لاہور	جب پاکستان نے آنکھ کھولی	زندگی، لاہور ۱۰ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۱ تا ۱۳
محمد احسن علیگ، چودھری	۱۴ اگست۔ آزادی کا روز اول	قندیل لاہور یوم آزادی نمبر ۱۹۷۰ء ص ۶
محمد سرور	پاکستان کا مطلب کیا؟ تاریخی عوامل کی روشنی میں	امروز لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۳
مرغوب صدیقی	پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا پس منظر	امروز لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۲

مسعود اسلم میاں	ہمارا پاکستان۔ ایک جغرافیائی جائزہ (۴)	پنجاب دی آواز، لاہور یکم اگست ۱۹۷۰ء ص ۵
مصطفیٰ علی بریلوی، سید	عروج وزوال کی افسوس ناک داستان اور قیام پاکستان	حریت کراچی ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء ص ۵
مہر، مولانا غلام رسول	دل ہلا دینے والے مناظر۔ (ابتدائی تاریخ) پاکستان کی ایک جھلک	لیل ونہار کراچی ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۱۵ تا ۱۶
		لیل ونہار کراچی ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۱۵ تا ۱۶
" "	۱۴ اگست کی قومی تقریب	امروز لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۳
نذر احمد سید	مارشل لا سے مارشل لا تک (۱۷۸)	سنڈے مشرق، کراچی ۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۸
" "	" " " (۱۷۹)	" " ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۸
" "	" " " (۱۸۰)	" " ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۸
" "	" " " (۱۸۱)	" " ۸ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۸
" "	" " " (۱۸۲)	" " ۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۸
نور الصباح بیگم	تحریک پاکستان میں خواتین کا حصہ۔ بیگم اختر سلیمان سے ایک انٹرویو	پاک جمہوریت، لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۵ تا ۱۶
		پاک جمہوریت، لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۵ تا ۱۶

ولی اللہ دہلوی، شاہ

محمد سرور (مترجم)	شاہ ولی اللہ کے دور کے اخلاقی و اجتماعی حالات [1]	المعارف، لاہور نومبر ۱۹۷۰ء ص ۴۱ تا ۴۴
یعقوب حسن، سید	جذبۂ تحریک پاکستان کو زندہ کرنے کی ضرورت	مشرق لاہور ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء ص ۴
یعقوب حسن، سید	اسلام اور نظریۂ پاکستان (۱۶)	سنڈے مشرق کراچی ۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۳
" "	" " " (۱۷)	" " ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۳
" "	" " " (۱۸)	" " ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۳
" "	" " " (۱۹)	" " ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۳
" "	" " " (۲۰)	" " یکم نومبر ۱۹۷۰ء ص ۳
" "	" " " (۲۲)	" " ۱۵ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۳
" "	" " " (۲۳)	" " ۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۳
ـــــ	تحریک پاکستان کے چشم دید حیرت انگیز واقعات	پاک جمہوریت۔ لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۲ تا ۱۴
	میاں امیر الدین سے ایک انٹرویو	پاک جمہوریت، لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۲ تا ۱۴

[1] شاہ صاحب کی تصنیف التفہیمات الالہیہ جزو اول کی تفہیم (۶۹) کے ایک حصے کا ترجمہ۔

—	جلیانوالہ باغ کا خونیں حادثہ	العلم کراچی اپریل ۱۹۷۰ء ص ۴۱ تا ۶۷

جماعت اسلامی اور تحریک پاکستان

اعجاز احمد	تحریک پاکستان اور جماعت اسلامی	نوائے وقت لاہور ۲ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۶
آزاد، محمد شریف	"	" " " " "
سجاد، محمد عمر	"	" " " " ص ۲
شمیم، محمد حسین	جماعت اسلامی اور تحریک پاکستان	نوائے وقت، لاہور ۷ جولائی ۱۹۷۰ء ص ۶
عبد الحمید صدیقی	جماعت اسلامی کا تاریخی کردار	ترجمان القرآن، لاہور دسمبر ۱۹۶۹ء ص ۲۹ تا ۳۸
ماہر القادری	جماعت اسلامی ـ تعارف جائزہ	جسارت کراچی ۵ دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۱
محمد جنید گوجرہ	تحریک پاکستان اور جماعت اسلامی	نوائے وقت، لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۶

فسادات

کاردار، فدا احمد	۱۹۴۷ء کے فسادات کا ایک ورق	حریت کراچی ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء ص ۶
مصطفیٰ علی بریلوی، سید	بیلی بھیت کے مسلمانوں کی عظیم قربانیاں (بسلسلہ فسادات)	حریت کراچی ۷ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱
" "	بھرت پور میں خون مسلم کی ارزانی	حریت، کراچی ۲۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱
" "	حیدر آباد جو کبھی مسلمانوں کی عظمت کا نشان تھا	حریت کراچی ۱۴ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱
" "	کلکتے میں مسلمانوں کا قتل عام	" " ۲۱ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱

تحریک آزادی کشمیر

اکبر خان	جب سری نگر چار میل رہ گیا	لیل و نہار کراچی ۱۱ اگست ۱۹۶۹ء ص ۲۱ تا ۲۶
امجد بٹ، مجید	تحریک حریت کشمیر اور تحریک پاکستان [1]	قندیل لاہور یوم آزادی نمبر ۱۹۶۰ء ص ۸

معرکہ ستمبر ۱۹۶۵ء

انعام الحق	پاکستانی فضائیہ	جنگ کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۳

[1] اسی نمبر میں تحریک آزادی کے بارے میں منظور طارق اور اجمل نیازی کے مضامین بھی شامل ہیں۔

بشیر حسین جعفری	چھ ستمبر اور کشمیر	ایام، لائل پور ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲
خلیق قریشی	جنگ ستمبر اور قرآن حکیم	عوام لائل پور ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۳
شبیر علی خاں، نواب زادہ	جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء	ہمدرد ڈائجسٹ کراچی ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱ تا ۲۳
عارف، لیفٹیننٹ خالد محمود	سیالکوٹ کا محاذ	پاک جمہوریت لاہور، ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲۳
عباسی، ع۔ع	یورپ پر ہند و پاک جنگ کے اثرات	حریت کراچی ۱۱ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۸
عبدالرحمٰن صدیقی، بریگیڈیر	دفاع اور مزاحمت جنگ کے چند پہلو	جنگ کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲۰
فیض محمد سومرو	۱۹۶۵ء کی جنگ میں حر مجاہدین کے کارنامے	جسارت کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲
محمد سعید، حکیم	عساکر پاکستان	عوام لائل پور ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۵
مظہر علی شاہ، لفٹیننٹ کرنل	پاکستانی طریق جنگ	جسارت کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۵
" " " "	ہمارے دفاعی تقاضے	آج کل، کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۸ تا ۱۹
—	معرکۂ ستمبر۔ اعداد و شمار کی روشنی میں	آج کل، کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۴
—	پاک فضائیہ کے شاہینوں کے کارنامے	آج کل کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۵ تا ۱۶
—	پاک آرمی کے سرفروش	آج کل کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۵ تا ۱۰

مجاہدین معرکۂ ستمبر ۱۹۶۵ء

اختر نگامی	جنگ ستمبر کے ہیرو ایم ایم عالم	جسارت کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۳
انیس احمد	چونڈہ کی جنگ کا ہیرو میجر ضیا، عباسی شہید	جسارت کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲
پرویز، غلام احمد	ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی (شہدائے پاکستان کی یاد میں)	طلوع اسلام، لاہور اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۹ تا ۴۴
خالد، شمس الدین	کموڈور انور	جسارت کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۵
شاہین، علی محمد	چونڈہ محاذ کا ہیرو میجر ضیاء الدین عباسی [1]	جنگ کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۸
عارف اسحاق	جنگ ستمبر کا ایک ہیرو اسکواڈرن لیڈر اسلم قریشی شہید	جنگ کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۴
قمر پیرزادہ	راجستھان کا غازی۔ سید گل شیر علی کاظمی سے ایک انٹرویو	آج کل کراچی ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲۰ تا ۲۱

---

[1] جنگ کا یہ نمبر دفاع پاکستان ایڈیشن ۱۹۷۰ء ہے اس میں اور بھی مبصرین، مشاہدین وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔

سیاسیات ملکی

احمد الطاف	سندھ کی سیاست - ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد،	لیل و نہار، کراچی ۱۲ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۳۱ تا ۳۲
اسرار احمد	پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش اور اسلام	میثاق، لاہور ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۷ تا ۴۰
الطاف حسن قریشی	یہ سیاسی جنگ ہمیں کہاں لے جائے گی	اردو ڈائجسٹ، لاہور نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۵ تا ۳۲
" "	مشرقی پاکستان کا سیاسی جائزہ	زندگی لاہور ۱۰ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۱ تا ۱۸
" "	" " "	" " ۱۲ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۱ تا ۱۷
" "	انتخابات سے پہلے - انتخابات کے بعد -	جسارت، کراچی ۲ دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۸
آباد شاہ پوری	ملی وحدت کا خاتمہ	سیارہ لاہور اگست ۱۹۷۰ء ص ۳۳ تا ۴۴
تقی عثمانی، محمد	انتخابات اور ہم	البلاغ، کراچی نومبر ۱۹۷۰ء ص ۳ تا ۸
" "	" "	" " دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۳ تا ۱۴
حامد علی قریشی، مولانا	۱۱ستمبر ۱۹۴۸ء سے ۱۱ستمبر ۱۹۷۰ء تک	جنگ، کراچی ۱۲ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۹
راشدی، پیر علی محمد	ون یونٹ کی تاریخ (۳)	جنگ، کراچی ۲۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۲۰
" "	" " (۵)	" " ۳۱ اگست ۱۹۷۰ء ص ۲۰
" "	" " (۸)	" " ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۲۰
" "	" " (۹)	" " ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۲۰
احمد اللہ خاں، رئیس	ون یونٹ (۱۹۴۸ء کی کانفرنس کا خطبۂ استقبالیہ)	مہر نیمروز، کراچی اگست ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۵۲ تا ۶۲
سبط حسن	شہید ملت کی وفات سے ایوب خاں کے زوال تک	لیل و نہار، کراچی ۸ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۱۳ تا ۱۴
ظہیر اختر بیدی	مشرقی پاکستان کی انقلابی قوتیں	لیل و نہار، کراچی ۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۳۱ تا ۳۲
عبدالرحیم، خواجہ	اہم اور بنیادی دستوری مسائل	چٹان لاہور ۲۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۸
عبدالرحیم پراچہ، ڈاکٹر	سندھ کے مخصوص مشکل مسائل	جنگ کراچی ۵ دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۲
عبدالوحید، خواجہ	بگاڑ کا ذمہ دار کون ہے؟ (۱) دانش ور	زندگی لاہور، ۱۷ اگست ۱۹۷۰ء ص ۳۱ تا ۳۴
" "	معاشرے کی برائیوں کے ذمہ دار لوگ	زندگی لاہور ۲۲ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۴۰ تا ۴۲
" "	(۲) سیاست داں	" " " " ص ۴۰ تا ۴۲
" "	(۳) ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات	" " ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲۶ تا ۲۸

عبدالوحید، خواجہ	(۴) سرمایہ دار	زندگی لاہور ۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۱۳ تا ۲۲
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	آئندہ انتخابات میں ملک کی نجات کا واحد راستہ	چٹان لاہور ۹ر نومبر ۱۹۷۰ء ص ۷ تا ۱۲
" " "	" " " (۲)	" " ۱۶ر نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۱ تا ۲۲

پاکستان ـ شہر اور صوبے

اعظم سعیدی، محمد	بہاول پور کے عباسی خاندان کا آغاز	نوائے وقت لاہور ۲ر اگست ۱۹۷۰ء ص ۸
نورالصباح بیگم	سندھ اور اس کے حکمراں (۱)	آج کل کراچی ۲۸ر اگست ۱۹۷۰ء ص ۳۵
" "	" " (۲)	" " ۴ر ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۳۷
ــــ	حیدرآباد	پاک جمہوریت، لاہور ۲ر جولائی ۱۹۷۰ء ص ۱۵
ــــ	خیبر کا پاسبان ـ پشاور	پاک جمہوریت، لاہور ۲ر جولائی ۱۹۷۰ء ص ۲۶
ــــ	علم و فن کا گہوارہ ـ لاہور	پاک جمہوریت لاہور ۲ر جولائی ۱۹۷۰ء ص ۱۲
ــــ	کوئٹہ ـ ایک حسین شہر	پاک جمہوریت، لاہور ۲ر جولائی ۱۹۷۰ء ص ۲۳

جوناگڑھ

اختر جوناگڑھی، قاضی محمد	ریاست جوناگڑھ کا ماضی و حال	جنگ کراچی ۹ر نومبر ۱۹۷۰ء ص ۲

حیدرآباد دکن

حسن یار جنگ، نواب	حیدرآباد کا قصور کیا تھا؟	جسارت کراچی ۱۹ر ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱
نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر	حیدرآباد ــ تاریخی پس منظر	آج کل، کراچی ۲۸ر اگست ۱۹۷۰ء ص ۲۰ تا ۲۲
یٰسین زبیری، ڈاکٹر محمد	حیدرآباد دکن ـ جنوبی ہند کا پاکستان	جسارت کراچی ۱۹ر ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۲

تاریخ و سیاست عالم

اخلاص حسین زبیری	سلطان صلاح الدین ایوبی کے درخشندہ کارنامے	العلم کراچی جولائی ۱۹۷۰ء ص ۱۰۳ تا ۱۰۷
امیر علی، سید محمد ہادی حسن (مترجم)	دنیائے قبل از اسلام پر ایک نظر	المعارف، لاہور۔ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۳ تا ۲۸

مصنف	عنوان	ماخذ
انعام اللہ خاں	دنیائے اسلام پر ایک نظر	آج کل، کراچی ۲۸ اگست ۱۹۷۰ء ص ۷ تا ۸
آفتاب انجم	بیت المقدس جل رہا ہے	جنگ کراچی ۲۲ اگست ۱۹۷۰ء ص ۲۰
بار اختا، پ	آج کی دنیا اور تاریخ کا سبق	طلوع کراچی ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۸ + ۲۰ تا ۲۱
خالد کمال مبارک پوری، مولانا	تبوک: ماضی اور حال کے آئینے میں	المنبر لائل پور ۲ رجب ۱۳۹۰ھ ص ۳ تا ۴
رکابی، زین الدین	سوڈان کے اندرونی حالات پر ایک نظر	ترجمان القرآن، لاہور ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۴۲ تا ۵۶
شریف خان بی، م	سرزمین اندلس	نوائے وقت، لاہور ۳ جولائی ۱۹۷۰ء ص ۱
ضیاء الاسلام انصاری	اردن کا آتش فشاں (۱)	زندگی لاہور ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۱۱ تا ۱۵
"	" " " (۲)	" " ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۱۱ تا ۱۴
"	" " " (۳)	" " ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۲۱ تا ۲۴
"	" " " (۴)	" " ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۲۳ تا ۲۷
"	" " " (۵)	" " ۲ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۵ تا ۱۸
"	" " " (۶)	" " ۸ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۱ تا ۱۴
"	" " (۷)	" " ۱۵ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۲۷ تا ۳۰
"	" " " (۸)	" " ۲۳ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۳۱ تا ۳۴
ظفر، عبد الرؤف	اردن کی خانہ جنگی	سنڈے مشرق کراچی ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۵
عابد، عبد الکریم	عرب سیاست کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟	جسارت کراچی ۳۰ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱
عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز، شیخ	عربی قومیت کا تنقیدی جائزہ (۱)	المنبر لائل پور ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۵ تا ۶
" "	" " " (۲)	" " ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص
" "	" " " (۳)	" " ۱۳ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۴ تا ۷
" "	" " " (۴)	" " ۲۰ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۶ تا ۸
" "	" " " (۵)	" " ۲۱ دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۲
علی محسن صدیقی	اسلام سے پہلے عرب کی مذہبی حالت	بینات، کراچی ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲۱ تا ۴۰
فارق، ڈاکٹر خورشید احمد	عہد عثمانی کا اقتصادی جائزہ	برہان، دہلی ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۷۸ تا ۱۹۴
فاروقی، عباد اللہ	خلافت عثمان اور مدینہ کا سیاسی انقلاب	ترجمان الحدیث۔ لاہور اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۴۷ تا ۵۵
"	" " " "	

مصنف	عنوان	ماخذ
قیصر، سید ازہر شاہ	عہد فاروقی کی ایک جھلک	قندیل لاہور ۱۲ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۵
محمد سعید	مسجد اقصیٰ کا تحفظ	مشرق، لاہور ۱۲ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱
" "	مکہ میں مسلمان فاتحین کا داخلہ	سنڈے مشرق، کراچی ۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱
محی الدین ایم اے	سعودی عرب	چٹان، لاہور ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۵ تا ۸
مزمل یقین صدیقی، کمانڈر	صلاح الدین ایوبی اور فتح بیت المقدس	پاک جمہوریت، لاہور ۳ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۰ تا ۱۱
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	سانحہ مسجد اقصیٰ	مشرق، لاہور ۱۲ اگست ۱۹۷۰ء ص ۳
" "	" "	جسارت کراچی ۲۲ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱
مہر، مولانا غلام رسول	مشرق وسطیٰ اور امریکہ	لیل و نہار، کراچی ۳ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۱
" "	کیا روس نے عربوں کو مشروط امداد دی ہے	لیل و نہار کراچی ۱۲ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۲
" "	فلسطین کے جہد آزما فرزند	لیل و نہار کراچی ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۷ تا ۸
" "	مشرق وسطیٰ اور مسئلہ صلح و جنگ	" " ۸ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۱ تا ۱۲
نظام الملک	مشرق وسطیٰ میں عرب اسرائیل جنگ بندی کا پس منظر	جسارت کراچی ۱۶ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۲
یوری ویلی	آج کا تاجکستان	اسپوتنگ ڈائجسٹ، کراچی جولائی اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۴ تا ۱۵

سیاست — اصول و مسائل

مصنف	عنوان	ماخذ
ابوبکر غزنوی، پروفیسر سید	اسلامی ریاست کے چند ناگزیر تقاضے (۲)	چٹان لاہور ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۹ تا ۱۸
" "	" " " (۳)	" " ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۱۰ + ۱۵
ذہین شاہ تاجی، بابا	حکومت الٰہیہ اور اتحاد المسلمین	تاج کراچی جولائی اگست ۱۹۷۰ء ص ۴۴ تا ۴۸
رحمان، جسٹس ایس اے	آزادی کے تقاضے اور ہم	پاک جمہوریت، لاہور ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۵ تا ۲۸
سحر، صفیہ نسیم	آزادی اور آزادیٔ شعور	جنگ کراچی ۱۰ اگست ۱۹۷۰ء ص ۳
ظفر فاروقی	حکومت اور نظام حکومت	تہذیب الاخلاق، کراچی اگست ۱۹۷۰ء ص ۳۳ تا ۳۴
" "	" " "	" " ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۳ تا ۲۰
عبدالقادر، محمد	سلطنت کا نظریہ اقتدار اعلیٰ	ساغر کراچی ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء ص ۵
عزیز الحق	معیار زندگی اور آزادی	ادب لطیف لاہور جولائی اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۲ تا ۱۸
غلام السیدین، غلام	نظام اجتماعی	مہر نیمروز۔ کراچی اگست ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۴۱ تا ۵۱

محمد شفیع، رانا	حکومت و ریاست کی حقیقت غلط	الجامعہ محمدی شریف اگست ۱۹۷۰ء ص ۳۱ تا ۳۶
محمد علی صدیقی	جمہوریت ۔ تاریخ و تجزیہ	حروف، کراچی اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۴۱ تا ۵۲
ــــــ	پان اسلام ازم اور پاکستان کی خارجہ پالیسی (۱)	لیل و نہار، کراچی ۸ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۵ تا ۱۶

تصوّف

تاجی، بابا ذہین شاہ	بجواب "کیا موجودہ تصوف اسلامی ہے؟"	العلم کراچی اپریل ۱۹۷۰ء ص ۱۱۵ تا ۱۲۶
"	" " " (۲)	" " جولائی ۱۹۷۰ء ص ۱۰۸ تا ۱۲۱
"	تصوف کے نظریے	تاج کراچی جولائی اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۸ تا ۲۸
"	تصوف کے مختلف نظریے	" " ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۷ تا ۵۹
"	غزل	" " جولائی اگست ۱۹۷۰ء ص ۸۱ تا ۸۴
حبیب احمد صدیقی	تصوف کے مختلف نظریے	فاران کراچی جون ۱۹۷۰ء ص ۲۷ تا ۳۴
خلیق اے خاں مترجم: ادیبہ برنی	تصوف ہماری شاعری کی روح ہے	پاک جمہوریت لاہور ۳ اگست ۱۹۷۰ء ص ۲۲
عبدالقیوم، پروفیسر	تصوف صوفیہ کی نظر میں	ترجمان الحدیث، لاہور دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۳۳ تا ۳۸
عبدالمجید یزدانی، پروفیسر محمد	قیام کا تفلسف و تصوف	المعارف، لاہور اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۳ تا ۲۵
عبیداللہ قدسی	مولوی صاحب اور تصوف	تاج کراچی ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۶۸ تا ۷۱
غلام عابد خاں	تصوف اسلام کی علمی خدمات	سلسبیل، لاہور اگست ۱۹۷۰ء ص ۲۷ تا ۳۴
مجید یزدانی، پروفیسر ایم اے	تصوف کی حقیقت	المعارف لاہور ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲۹ تا ۳۶
یوسف سلیم چشتی، پروفیسر	تاریخ تصوف اسلامی ۔ خلاصہ مضامین کتاب اللمع (۱)	میثاق، لاہور ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۶۷ تا ۷۴

تعلیم

بشیر حسین جعفری، سید	اسلام میں دینی تعلیم کی اہمیت	نوائے وقت ۔ لاہور ۲۰ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۲ + ۱۱
جعفر، جعفر حسن	قدیم یونان میں تعلیم	سیارہ لاہور ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۳۰ تا ۳۴
" "	" " "	" اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۳۹ تا ۴۴
حامد علی جعفری	ابتدائی تعلیم اور اساتذہ	فکر و خیال کراچی جون جولائی ۱۹۷۰ء ص ۶ تا ۱۲

زینو فین		
مترجم . شہیر نیازی	فرمودات سقراط	بصائر . کراچی جولائی، اکتوبر ۱۹۷۹ء ص ۱ تا ۲۲
عبدالقیوم، پروفیسر	ہمارا نظام تعلیم	ترجمان الحدیث، لاہور اکتوبر ۱۹۸۰ء ص ۳۱ تا ۳۵
علی شبیر کاظمی، سید	جدت اور تعلیم	الجامعہ، محمدی شریف اگست ۱۹۸۰ء ص ۱۱ تا ۱۴
غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر	ثانوی جماعتوں کے اردو نصابات پر ایک نظر	قومی زبان، کراچی مئی ۱۹۸۰ء ص ۲۷ تا ۳۷
محمد حسین	فنی تعلیم کی ترقی میں نجی شعبے کا کردار	آج کل کراچی ۱۴ اگست ۱۹۸۰ء ص ۳۷
مصطفیٰ علی بریلوی، سید	مسلمانان سرحد کی تعلیم - ایک تاریخی جائزہ	العلم کراچی اپریل ۱۹۸۰ء ص ۸۴ تا ۹۲
نواز رعنا	تعلیم اور اساتذہ	چٹان لاہور، ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۱۵ تا ۱۶

تعلیمی، تحقیقی، اشاعتی ادارے

امیرالدین، میاں	انجمن حمایت اسلام - ایک ادارہ الگ تحریک	جنگ کراچی ۲۶ ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۱۲
حفیظ اللہ پھلواردی، محمد	پہلا اسلامی مدرسہ	انجمن، کراچی ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۹ تا ۱۱
صدیق طاہر	جامعہ اسلامیہ بہاولپور	جنگ، کراچی ۱۷ نومبر ۱۹۸۰ء ص ۳
عالی، جمیل الدین	انجمن - بابائے اردو کے بعد	قومی زبان کراچی اگست ۱۹۸۰ء ص ۹ تا ۱۴
عبدالمنان دہلوی	خیرالمدارس ملتان و بانیہا	بینات کراچی ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۴۵ تا ۵۶
محمد سرور	سوڈان میں عرب دانش وروں کا اجتماع	المعارف . کراچی اکتوبر ۱۹۸۰ء ص ۲۶ تا ۳۷
محمود الرحمٰن	نیشنل پبلشنگ ہاؤس	کتاب لاہور جولائی اگست ۱۹۸۰ء ص ۱۷
مصطفیٰ علی بریلوی، سید	نالندہ یونی ورسٹی کی تباہی اور شنکر آچاریہ	آج کل، کراچی ۱۴ اگست ۱۹۸۰ء ص ۴۱
مہر، مولانا غلام رسول	تقسیم پنجاب پر نئی روشنی	لیل و نہار کراچی ۲۴ اگست ۱۹۸۰ء ص ۱ تا ۱۲

تہذیب و ثقافت

برہان احمد فاروقی، ڈاکٹر	اسلامی تقریبات	حریت کراچی ۲ دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۲
جاوید چشتی، قاضی	ثقافت کا مسئلہ	امروز لاہور ۱۴ اگست ۱۹۸۰ء ص ۲
جمیل جالبی	۲۵ سال کی ذہنی و ثقافتی تحریکیں	افکار کراچی جوبلی نمبر ۱۹۸۰ء ص ۹۱ تا ۹۷
سعید ہاشمی	ہماری رسوم اور اجتماعی زندگی پران کا اثر	پاک جمہوریت، لاہور ۲۱ اگست ۱۹۸۰ء ص ۱ تا ۱

سکندر حیات

مترجم : ا ۔ م	پنجاب کے عرس اور میلے	پاک جمہوریت، لاہور ۳ اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۲
عباد اللہ فاروقی	ایام جاہلیت کے عرب اور ان کے رسوم	سیارہ ، لاہور ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۳۵ تا ۴۳
عبد المجید یزدانی، پروفیسر محمد	تمدن، تہذیب، ثقافت اور فنون لطیفہ	المعارف، لاہور نومبر ۱۹۷۰ء ص ۲۹ تا ۴۰
عبد الواحد سندھی	سندھ کے لوگ گیت	ساقی ، کراچی مئی جون ۱۹۷۰ء ص ۲۶ تا ۲۸
محمد عمر ، ڈاکٹر	ہندو تہذیب اور مسلمان	برہان ، دہلی ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۲۰۴ تا ۲۱۱
محمد علی صدیقی	قومی ثقافت کی تلاش میں	نیا دور، کراچی ۱۹۷۰ء نمبر ۵۳، ۵۴ ص ۲۶۲ تا ۲۷۰
معین الحق ، ڈاکٹر سید	پاکستانی کلچر میں نظریۂ پاکستان کی اہمیت	بصائر، کراچی جولائی و اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۳ تا ۱۱
ــــ	کلچر کیا ہے ؟[1] (۱)	لیل و نہار کراچی ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۱۲ تا ۱۳
	" " (۲)	" " " یکم نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۶ تا ۱۷
	" " (۳)	" " " ۸ ، نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۳ تا ۱۴
	" " (۴)	" " " ۱۵ ، نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۵ تا ۱۶

رقص و موسیقی

راجپوت ، اے بی

ادیب بزمی (مترجم)	پاکستان کے لوک ناچ	پاک جمہوریت ، لاہور ۲ جولائی ۱۹۷۰ء ص ۴۳ تا ۴۴
رشید ملک	غلطیہائے مضامین[2]	فنون لاہور جولائی اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۲۸ تا ۱۳۰
ظہیر، احسان الہٰی	موسیقی اور اسلام (۱)	ترجمان الحدیث ، لاہور اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۵ تا ۲۲
" "	" " (۲)	" " ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۶ تا ۲۲
" "	" " (۳)	" " اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۱۸ تا ۳۰

مصوری

ظفر	حمید شیخ کا تجریدی اظہار ۔ فرحانہ یوسف خان کی مصوری	حریت کراچی ۲۹ جون ۱۹۷۰ء ص ۸

[1] ۱۹۶۸ء میں وزارت تعلیم حکومت پاکستان کی ایک کمیٹی کی رپورٹ کا ایک حصہ ۔

[2] پاکستان ٹائمز لاہور میں فیروز نظامی کے سلسلہ مضمون کے بارے میں چند شکوک و شبہات کا اظہار ۔

علی عباس جلال پوری، سید	ایرانی مصوری	فنون لاہور جولائی اگست ۱۹۶۸ء ص ۱۲۰ تا ۱۲۷

فن کار

جوہر، تریجے رام	اختر بلال زبیری "ایک مصور"	نقش کراچی ۱۹۶۸ء نمبر ۲ ص ۱۵۹ تا ۱۶۰
صفدر ادیب	اے کریم آرٹسٹ سے ملاقات	کتاب، لاہور اکتوبر ۱۹۶۸ء ص ۲۵ تا ۳۰
مسعود حسین، آغا	صادقین کا فن	حریت کراچی ۱۰ نومبر ۱۹۶۸ء ص ۳
ملاقاتی	سلیم اختر آرٹسٹ	کتاب، لاہور جولائی اگست ۱۹۶۸ء ص، تا ۹
——	نوجوان مصور ۔ امین الاسلام ۔	پاک جمہوریت ۔ لاہور، ۲۹ جولائی ۱۹۶۸ء ص ۲